ISSN 0974-7346

جولائی ۲۰۲۵ء

جلد ۲۱۲ ــــــ عدد ۷

معارف

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

AZAMGARH

سالانہ زرتعاون

ہندوستان میں	:	سالانہ ۴۰۰؍روپے۔ فی شمارہ ۴۰؍روپے رجسٹرڈ ڈاک ۱۰۰۰؍روپے
		ہندوستان میں ۵ سال کی خریداری صرف ۱۸۰۰؍روپے میں دستیاب ہے۔
		ہندوستان میں لائف ممبرشپ ۱۰۰۰۰؍روپے ہے۔
دیگر ممالک میں	:	سادہ ڈاک ۱۷۳۰؍روپے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۱۸۵۰؍روپے

اشتراک پی ڈی ایف بذریعہ ای میل (ساری دنیا میں) ۴۰۰؍روپے سالانہ

ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ڈاک کا سلسلہ بند ہے۔ اس لئے فی الحال پاکستان معارف کی ترسیل موقوف ہے۔

سالانہ چندہ کی رقم بینک ٹرانسفر، منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔

بینک ٹرانسفر کرکے ہم کو ضرور اطلاع دیں۔ بینک اکاؤنٹ کی تفصیلات یہ ہیں:

Account Name: DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh
Account No: 4761005500000051 - IFSC : PUNB0476100

بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

● زرتعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کردیا جائے گا۔ ● معارف کا زرتعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔ ● خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔ ● معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔ ● کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کے تصنیفی اور نشریاتی کام میں مدد کے لیے اس اکاؤنٹ پر تعاون کریں:

بینک کا نام: Punjab National Bank

اکاؤنٹ نمبر: 4761005500000051

آئی ایف ایس سی: PUNB0476100

تعاون بھیجنے کے بعد تفصیلات سے ہم کو اس ایمیل پر مطلع کریں:

info@shibliacademy.org

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی CSR کے تحت رجسٹرڈ ہے۔ اب بڑی تجارتی کمپنیاں براہ راست دارالمصنّفین کو CSR کے تحت عطیات دے سکتی ہیں۔

نوٹ: غیر ممالک سے تعاون بھیجنے کے لیے بینک کی تفصیلات ایمیل بھیج کر حاصل کریں۔

Ma'arif Section: 06386324437

Email: info@shibliacademy.org website: www.shibliacademy.org

ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی (ڈپٹی ڈائرکٹر) نے معارف پریس میں چھپوا کر دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۲۱۲ | ماہ محرم الحرام ۱۴۴۷ھ مطابق ماہ جولائی ۲۰۲۵ء | عدد ۷

مجلس ادارت

پروفیسر شریف حسین قاسمی
دہلی
پروفیسر اشتیاق احمد ظلی
علی گڑھ
ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی
دہلی

مرتبہ
ڈاکٹر ظفر الاسلام خان
محمد عمیر الصدیق ندوی
کلیم صفات اصلاحی

ادارتی سیکریٹری:
ڈاکٹر کمال اختر

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱
info@shibliacademy.org

فہرست مضامین

شذرات	محمد عمیر الصدیق ندوی	۲
مقالات		
مولانا عبد الماجد دریا بادیؒ کی قرآنی خدمات	فضل الرحمٰن اصلاحی	۵
اسلامی ڈیموکریسی، راشد غنّوشی کی نظر میں	سعیدہ شریف	۱۷
شذراتِ سرسید جلد اول: ایک مطالعہ ہندو- مسلم مسائل و تعلقات کے تناظر میں	کلیم صفات اصلاحی	۲۴
نوادرِ سہیل	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	۴۲
حکیم ضیاء الدین رامپوریؒ	محمد زبیر سہیل	۵۱
فارغین مدارس عربیہ اور اردو	ڈاکٹر ظفر الاسلام خان	۶۱
اخبار علمیہ	ک۔ص اصلاحی	۶۶
تبصرۂ کتب	ع۔ص	
	ک۔ص اصلاحی	۶۷
ادبیات		
قصیدہ (منظوم ترجمہ قصائد حضرت حسان)	ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی	۷۲
رسید کتب موصولہ		۸۰

شذرات

اس سال جون کا یہ مہینہ اگر خون کا مہینہ کہا جائے تو یہ زیادہ حیرت کی بات نہیں۔ اصلاً ماہ و سال وسنین کی جدول و تقویم رب کائنات کی تخلیق و تعیین ہے۔ بہار و خزاں اور موسموں کا تغیر و تبدل بنیادی طور پر دنیا بنانے والے کی صفت احسن تقویم کی علامت ہے۔ یہ تو انسان کا عمل ہے جو احسن کو اسفل میں بدلنے کا سبب بن جاتا ہے۔ یہ ابتدائے آفرینش سے جاری ہے اور جیسے جیسے دنیا کی زندگی اپنی آخری ساعت سے قریب تر ہوتی جاتی ہے انسان کی سرشت میں شامل فساد اور خون ریزی کی خرابی بھی دنیا کی ویرانی میں اضافہ کا سبب بنتی جاتی ہے۔ اس لئے اب جون ہی کیا وقت کا ہر پل جیسے خون میں نہانے کا منظر ہو گیا ہے۔

***

حادثات تو روز و شب کے نقش گر ہوتے ہی ہیں لیکن بعض حادثے ذہن و دل پر اس طرح چھا جاتے ہیں کہ راحت و اطمینان کی ہلکی سی رمق سے بھی محرومی کا احساس ہوتا ہے بارہ جون کو احمد آباد سے لندن جانے والے طیارے کا حادثہ ایسا ہی تھا، جہاں پر پرواز کھلنے بھی نہ پائے تھے کہ دو سو اکتالیس زندگیاں تقدیم و تاخیر کے پیمانوں سے بے نیاز ہو کر عمر کی مقررہ حد کو پہنچ گئیں یہ حادثہ دنیاوی زندگی کی بے ثباتی اور ظاہری منصوبوں، ارادوں اور مال و دولت اور رشتہ و پیوند کی ناپائیداری کی ایسی عبرت آموز داستان بن گیا جس میں بس اصل قادر مطلق کا وجود اپنا اعلان واقرار کراتا رہتا ہے۔ چشم زدن میں زندگی کا سیہ پوش ہو جانا اور ساتھ ہی زمین پر ایستادہ، مضبوط اور بلند و بالا عمارتوں کے مکینوں کا کھانے کی میزوں پر خود لقمہ اجل بن جانا۔ یہ سب درد و الم کی وہ تصویریں ہیں جن کو صرف وقت کی دھند چھپا سکتی ہے۔ لیکن یہی وقت یہ بھی یاد دلاتا ہے کہ زندگی کی حقیقت کیا ہے اور اگر یہی ہے اور یقینا یہی ہے تو پھر زندگی اور موت جس کے قبضۂ قدرت میں ہے، نظر اس کے سوا کسی اور پر کیوں ہو؟ موت ہو یا زندگی یہی سفر کا وہ ساز و سامان ہے جو یاد دلاتا ہے کہ اصل منزل مقصود کیا ہے؟ کیونکہ جس نے انسان کو اذنِ سفر دیا اس نے آگاہ بھی کیا تھا کہ "الینا ترجعون" لوٹ کے ہمارے ہی پاس آنا ہے۔

***

اسی جون میں انسانوں کی سفاکی اور خوں ریزی کا ایک رزمیہ، جنگ نامہ ایران کی شکل میں سامنے آیا۔ شرق اوسط میں تاریخ نے پھر اپنے آپ کو دہرانے کے عمل کا اظہار کیا۔ اس خطے میں ایک صدی سے زیادہ کی مدت سے بنی آدم کی سب سے ذلیل و خوار نوع نے مکر و فریب اور دجل و کید

کی بنیاد پر قوت و اقتدار کے جس نشہ کو اپنی لت بنایا اس کا نمونہ ساری دنیا نے فلسطین کے ایک چھوٹے سے خطہ میں دیکھ لیا کہ بچوں، بوڑھوں، مریضوں اور بھوک پیاس سے جاں بہ لب معصوموں کو خاک و خون میں ملا کر ساری انسانیت کو شرمسار کیا گیا۔ نسل کی بنیاد پر خود کو دوسرے انسانوں سے برتر سمجھنے والی قوم کی پہچان نظر والوں کے لئے چھپی بھی نہیں کہ اپنوں کی عداوت میں سب سے پیش پیش وہی ہیں جن کا نام یہود اور کام خدا کی خدائی میں دوسروں کو شریک کرنا ہے یہ وہ ظلم ہے جو ہر ظلم کو روا رکھنے کے شیطانی عمل کی دلیل بن جاتا ہے۔ ایسوں کے لئے غزہ پر ظلم ظاہر ہے ظلم کا خاتمہ نہیں ہو سکتا۔ ظلم کی توسیع کے لئے کچھ اور کی ضرورت نے ایران کی سرزمین کو اپنا نشانہ بنالیا۔

***

ایران کا خطہ دنیا کی تاریخ میں قدرت کے حسن و جمال کے شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے یہ مصرع مشہور بھی ہوا اور مقبول بھی کہ:

ہمہ عالم تن است و ایران دل

اور یہ شعر بھی کہ: چونکہ ایران دل زمین باشد دل ز تن بہ بود یقین باشد

عجب معاملہ ہے کہ انسان نما حیوانوں نے ہمیشہ دنیا کے اس دل کو برباد کرنا اپنا فریضہ سمجھا۔ اسلام سے پہلے یہ خطہ وقتاً فوقتاً تاخت و تاراج ہوتا رہا۔ اسلام کا ابرِ کرم برسا تو ایران کا اصل حسن بھی شباب پر آیا۔ فلسفہ وتصوف، علم و ادب، شعر وحکمت، صنعت و حرفت، یعنی شاندار تہذیب وتمدن کا وہ گہوارہ بن گیا، انسانی شرف و عظمت کی یادگاروں میں سب سے زیادہ آبادیاں، ایران کے نقشے پر ظاہر ہوئیں۔ صرف اصفہان کے بارے ہی میں کہا گیا کہ وہ نصف جہاں ہے کہ:

گفتست اصفہان نصف جہانست

لیکن جب جب اسلام کی بخشی ہوئی نعمتوں کی قدر نہ کی گئی تو وقت کے چنگیزوں، ہلاکوؤں اور تیموروں نے وہ منظر بھی دکھائے جہاں "اماکن و مساکن باخاک یکساں" نظر آئے۔

***

اب اسی جون میں ایک بار پھر وقت کے چنگیزوں نے ایران کو ویران بنانے کا غیر انسانی بلکہ بہیمانہ منصوبہ بنایا اور اس کے نتیجہ میں مہلک ترین ہتھیاروں کے ذریعہ انسانوں کے امن و امان کو غارت کیا۔ اس کے اسباب و علل کو ساری دنیا میں بیان کیا جارہا ہے۔ عالمی ذرائع ابلاغ، تبصروں اور تجزیوں کے انبار لگا رہے ہیں۔ مذہب، مسلک، تجارت، حکومت، شخصیت، جماعت خدا جانے کتنے عنوانوں سے موشگافیوں کا بازار گرم کیا جارہا ہے۔ حمایت، مخالفت، عداوت، منافقت، مصلحت سارے پیمانے گردش میں ہیں۔ ایران کی ایٹمی تنصیبات کی تباہی یا نئے حکمرانوں کی تقرری یا

یہودی فتنہ کاری کی توسیع وغیرہ اس کے انجام کی پیشن گوئیاں بھی ہیں۔ یعنی اہل سیاست کا جو فرض ہے وہ بہر حال پورا کیا جارہا ہے۔ لیکن جو اہل سیاست نہیں ہیں مگر ان کو دعوت و عزیمت کی داستانیں یاد ہیں، جن کے لئے صرف حق و انصاف اور امن و امان کا حصول ہی انسانیت کی اصل خدمت ہے، جن کی پہچان سارے جہانوں میں رحم و کرم کی نعمت کو عام کرنے والے کی بنائی گئی۔ جن کے لئے رنگ و نسل، علاقہ و زبان کی تفریق صرف ایک رب اور ایک اب کے رشتہ توحید میں بدل گئی کیا ان کے لئے یہ وقت نہیں آیا کہ انسانیت کے دشمن جن کی پہچان ان کا غرور اور ان کا استکبار ہے اور جن کا ہر عمل ان کے شیطانی ہونے کا ثبوت ہے۔ ایسے دشمنوں کے سامنے اس جذبہ کے ساتھ کھڑے ہو جائیں جو صرف حق و انصاف کے لئے خاص ہے۔ انسانوں کو شیطانوں کے غلبے سے آزاد کرانے کا یہ شریفانہ انسانی عمل اگر جہاد کے عربی لفظ سے پہچانا جاتا ہے تو اس کے عملی مفہوم سے دنیا کو روشناس کرانے کی ذمہ داری آخر کب ادا کی جائے گی؟ اصل معاملہ انسانیت کی بقا کا ہے۔ احترام آدمیت اور تکریم انسانیت کی نعمتیں جس سرچشمے سے جاری ہوئی ہیں، اس سرچشمہ کا فیضان، عام ہونا ہی چاہئے۔ اس راہ میں شیطانوں کی آہنی دیواریں اور آگ اور دھوئیں کی لپٹیں، کیا نارِ نمرود سے زیادہ مہلک ہیں؟ جب تک ان سچائیوں کی تلاش پھر سے نہیں کی جاتی۔ انسانیت کے زخموں کا مداوا بھی نہیں ہو سکتا۔ معاملہ یہود و مشرکین اور نصاری و قسیسین کا نہیں۔ یہ احسن تقویم اور اسفل سافلین کے فرق اور تمیز کا معرکہ ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ یہ وہ ستیزہ کاری ہے جو انسان اور شیطان کے پہلے وجود سے جاری ہے۔

سچ ہے کہ تاریخ اپنی نسل کو باخبر رکھنے کا ایک وقتی ذریعہ ہے۔ سو سال پہلے ۱۹۱۳ء میں ”فغان ایران“ کے نام سے حیدرآباد دکن سے ایک کتاب شائع ہوئی تھی یہ ایک انگریز مصنف کی کتاب تھی جس کو ام الاعظم بلگرامی نے اردو قالب عطا کیا تھا، اس کے دیباچہ کا آغاز علامہ شبلی کے اس شعر سے ہوا تھا کہ:

مراکش جا چکا ، فارس گیا اب دیکھنا یہ ہے
کہ جیتا ہے یہ ٹرکی کا مریض سخت جاں کب تک

اس وقت کیا خبر تھی کہ ٹھیک سو سوا سو سال بعد ایک بار پھر فغانِ ایران کی جدید تصنیف ہو گی۔ تاریخ زندہ ہونے اور زندہ رہنے کا ذریعہ ہے۔ اس وقت روس و برطانیہ کا وجود فغانِ ایران کا سبب بنا تھا جو جلد ہی عدم میں بدل گیا۔ یقیناً اسرائیل اور امریکہ بھی زیادہ دیر تک تاریخ کے اس فیصلے سے مستغنی اور مستثنیٰ نہیں رہ سکتے۔

* * *

مولانا عبد الماجد دریابادیؒ کی قرآنی خدمات

فضل الرحمٰن اصلاحی
islahi1980@gmail.com

مولانا عبد الماجد دریابادیؒ علامہ شبلیؒ اور علامہ فراہیؒ کے علاوہ مولانا اشرف علی تھانویؒ کے تربیت یافتہ تھے۔ وہ اپنے معاصرین میں ایک امتیازی شخصیت رکھنے والے صاحب نظر عالمِ دین تھے۔ وہ بیک وقت اردو و انگریزی کے مفسرِ قرآن، مبصر، صحافی، انشاء پرداز اور صاحب طرز ادیب تھے۔ شاہ معین الدین ندویؒ کے بقول: انہیں اس دور میں ادب و انشاء کے قلم رو کی حکمرانی نہیں بلکہ اس عہد کی صاحبِ قرانی ملی تھی۔[1]

پیدائش اور خاندانی پس منظر: مولانا دریابادیؒ کی پیدائش مارچ ۱۸۹۲ء (شعبان ۱۳۱۰ھ) میں دریاباد ضلع بارہ بنکی میں ہوئی تھی۔ ان کے والد لکھیم پور کھیری میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ دادا مفتی مظہر کریمؒ تھے جو شاہجہاں پور میں عدالت کلکٹری میں سر رشتہ دار[2] تھے، جو اس وقت ایک معزز عہدہ تھا اور ساتھ میں افتاء کا کام بھی کرتے تھے۔

مولانا دریابادیؒ کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ مولوی حکیم محمد علی اطہر دہلوی جو مولانا دریابادیؒ کے بڑے بھائی کے بھی استاد تھے، کے ذریعے رسم "بسم اللہ" ادا کرائی گئی، اس زمانے میں علمی گھرانے میں اس کا عام چلن تھا۔ مولانا دریابادیؒ ابھی عمر کے نویں سال میں تھے کہ ۱۹۰۱ء میں اسکول میں داخلہ لیا۔ اس کے بعد کیننگ کالج لکھنؤ سے انٹر میڈیٹ پاس کیا۔ مضامین انگریزی کے ساتھ منطق، تاریخ اور عربی تھے۔ جب بھی موقع ملتا لائبریری پہنچ جاتے اور مطالعے میں مشغول

(1) مولانا عبد الماجد دریابادی، آپ بیتی، مکتبہ فردوس، لکھنؤ، ۱۹۷۸ء، ص ۲۸

(2) یعنی میر منشی یا ہیڈ کلرک

ہو جاتے۔ اس مطالعے سے یہ فائدہ ہوا کہ مولانا کا مطالعہ عہد طالب علمی ہی سے وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ اس دوران مولانا نے گریجویشن بھی مکمل کر لیا۔ اس زمانے میں ایک گریجویٹ کی بہت اہمیت ہوتی تھی۔ لوگ فخر کے ساتھ اپنے نام کے آگے "بی اے" لکھتے تھے۔

اندازِ ترجمہ و تفسیر: سب سے پہلے ہم سورۃ الفاتحۃ کا ترجمہ کا جائزہ لیتے ہیں۔ مولانا دریابادیؒ نے اس کا ترجمہ ان الفاظ میں کیا ہے:

> (ساری) تعریف اللہ کے لیے ہے۔ (وہ) جہانوں کا مربی، (وہ) رحمٰن (وہ) رحیم (وہ) مالک روز جزاء کا۔ ہم بس تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور بس تجھی سے مدد چاہتے ہیں، چلا ہم کو سیدھا راستہ، ان لوگوں کا راستہ، جن پر تو نے انعام کیا ہے، نہ وہ لوگ جو زیر غضب آچکے ہیں اور نہ جو بھٹکے ہوئے ہیں۔

مولانا نے دیگر مفسرین سے ہٹ کر رحمٰن ور حیم کا ترجمہ نہیں کیا ہے۔ اس کی یہ وجہ بتائی ہے کہ دونوں ایک ہی مصدر "رحمۃ" سے مشتق ہیں جیسے ندیم و ندمان اور مفہوم دونوں کا اصلاً ایک ہی ہے۔[۳]

مولانا کا یہ کہنا کہ دونوں اصلاً ایک ہی ہیں، محل نظر معلوم ہوتا ہے، کیونکہ عربی کا قاعدہ ہے کہ عربی زبان میں جب دو مترادف الفاظ استعمال ہوتے ہیں تو لازماً ان کے درمیان ضرور فرق ہو گا۔ کیا اردو زبان میں مشہور و معروف کی طرح رحمان ور حیم کو قیاس کر لیا جائے۔ ؟ یا دیگر مفسرین کی طرح ان دونوں کے مابین جو بلاغت ہے اس کو ملحوظ خاطر رکھا جائے؟

الرحمن والرحیم کے درمیان فرق: الرحمان کا معنی 'لسان العرب' میں درج ذیل الفاظ میں مذکور ہے۔

الرَّحْمة الرِّقَّةُ والتَّعَطُّف والمَرْحَمَةُ مثله وقد رَحِمْتُهُ وتَرَحَّمْتُ عليه وتَراحَمَ القومُ رَحِمَ بعضهم بعضاً والرَّحْمَةُ المغفرة وقوله تعالى في وصف القرآن هُدىً ورَحْمةً لقوم يؤمنون أَي فَصَّلْناه هادياً وذا رَحْمَةٍ وقوله تعالى ورَحْمة[۴]

---

[۳] تفسیر ماجدی، جلد اول، مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ، ۲۰۰۳ء، ص ۳۴

[۴] الرحمان / لسان العرب https://www.maajim.com/dictionary/

اور الرحیم کا معنیٰ 'المنجد' میں یہ ہے:

الرحیم ج رحماء: الراحم، المرحوم

مولانا وحید الزماں کیرانویؒ نے 'القاموس الوحید' میں الرحمن اور الرحیم میں فرق کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

الرحمٰن: بڑا مہربان، زبردست رحمت والا، یہ صرف اللہ تعالیٰ کا وصف خاص ہے، غیر اللہ کے لیے یہ وصف جائز ہی نہیں۔

الرحیم: خصوصی رحمت والا مشفق و مہربان(۵)

مذکورہ سطور کا حاصل یہ ہے کہ رحمان اور رحیم میں واضح فرق ہے۔ رحمان میں جو رحمت اور شفقت ہے، وہ اللہ کی ذات کے ساتھ خاص ہے اور رحیم میں جو رحمت اور شفقت ہے، وہ عام ہے، اس میں ذات باری کے علاوہ انسان اور حیوان دونوں شامل ہیں۔

برسبیل تذکرہ یہ بات بھی لائق توجہ ہے کہ مولانا ابو الکلام آزادؒ کو بھی ان دونوں لفظوں میں فرق کرنے میں مغالطہ ہوا ہے۔ لغات ان تصریحات کا ساتھ نہیں دیتی ہیں۔ چنانچہ ان کے الفاظ ملاحظہ ہو:

> اگرچہ یہ دونوں اسم رحمت سے ہیں، لیکن رحمت کے دو مختلف پہلوؤں کو نمایاں کرتے ہیں۔ عربی میں فعلان کا باب عموماً عارضی صفات کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، جو محض صفات عارضہ ہوتے ہیں جیسے پیاسے کے لیے عطشان، غضب ناک کے لیے عضبان، لیکن فعیل کے وزن میں صفات قیامہ خاصہ ہے مثلاً کریم کرم کرنے والا، عظیم بڑائی رکھنے والا۔(۶)

اس موقع پر مولانا دریابادیؒ نے سورۃ الفاتحہ کا موازنہ "انجیلی دعاء" سے کیا ہے۔ ان دونوں کا موازنہ لائق مطالعہ معلوم ہوتا ہے۔ پہلے سورۃ الفاتحہ کا ترجمہ پڑھیں جو پچھلے صفحے پر گذر چکا ہے، پھر یہ انجیلی دعا پڑھیں:

انجیلی دعاء:

---

(۵) مولانا وحید الزماں کیرانویؒ القاموس الوحید، کتب خانہ حسینیہ دیوبند ۲۰۰۱ء ص ۶۰۹

(۶) مولانا ابو الکلام آزادؒ، تلخیص ترجمان القرآن، فرید بکڈپو، نئی دہلی، ص ۸۱۱

۱۔ اے ہمارے باپ تو جو آسمان پر ہے، تیرا نام پاک مانا جائے۔

۲۔ تیری بادشاہت آئے، تیری مرضی جیسی آسمان پر پوری ہوتی ہے، زمین پر بھی ہو۔

۳۔ ہماری روز کی روٹی ہمیں آج دے اور

۴۔ جس طرح ہم نے اپنے قرض داروں کو معاف کیا ہے، تو ہمارے قرض کو معاف کر۔

۵۔ اور ہمیں آزمائش میں نہ لا، بلکہ برائی سے بچا۔[۷]

مولانا دریابادیؒ نے ان دونوں کا موازنہ درج ذیل نکات کی صورت میں کیا ہے جس سے قرآن کے آفاقی مالکِ کائنات کا تصور جلوہ گر ہوتا ہے اور انجیلی دعا کی تنگ دامانی آشکار ہوتی ہے:

۱۔ کہاں رب العالمین کی لا محدود وسعت و ہمہ گیری اور کہاں آسمان پر بیٹھے رہنے والی بعید اور محدود اور پھر باپ جیسی محض، مادی تعلق رکھنے والی ہستی۔

۲۔ ایک طرف اعلان ہورہا ہے، ہمہ گیر صفاتِ ربوبیت، رحمانیت، رحیمیت، مالکیت کا اور دوسری طرف ان کی بجائے ذکر ہے صرف زمین پر آسمانی بادشاہت کے آنے کا۔

۳۔ توحید خالص پر جو زور قرآنی عبارت میں، منع عبادتِ غیر و منع استعانت بالغیر میں ہے، انجیلی دعاء میں کہیں اس کا پتہ تک نہیں۔

۴۔ انجیلی دعا کی آیت نمبر ۳ میں روٹی کی اس درجہ اہمیت، مادیت کی انتہا ہے۔

۵۔ محض برائی سے بچنے کی دعا، صراط مستقیم پر قائم رہنے کی نسبت سے کہیں زیادہ ہلکی ہے۔[۸]

اب مولانا دریابادی کی تفسیر کے چند نمونے بھی درج کیے جاتے ہیں۔ رب العالمین کی تفسیر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

رب العالمین کا لفظ لا کر قرآن مجید نے گویا بتا دیا کہ ہر صنف موجودات کا ایک مستقل نظام تربیت ہے اور سب کا آخری سرا اسی قادر مطلق واحد و یکتا کے ہاتھ میں ہے۔ کوئی بھی صنف موجودات اس کے ہمہ گیر نظام ربوبیت و تربیت سے آزاد و مستثنیٰ نہیں۔[۹]

پھر لکھتے ہیں:

---

(۷) متّیٰ ۶:۹-۱۳

(۸) تفسیر ماجدی جلد اول، ص ۴۴

(۹) تفسیر ماجدی جلد اول، ص ۹۶

قرآن مجید نے ایک لفظ رب العالمین لا کر ان سارے مشرکانہ و گمراہانہ عقائد کی تردید کر دی، مشرک قوموں کو سب سے زیادہ ٹھوکر صفت ربوبیت ہی کے سمجھنے میں لگی ہے، اسی لئے قرآن نے تصحیح میں بھی اسی کو مقدم رکھا۔(۱۰)

سورۃ البقرۃ (آیت ۳۰) وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ (ترجمہ: درآنحالیکہ ہم تیری حمد کی تسبیح کرتے ہیں اور تیری پاکی پکارتے رہتے ہیں)۔

اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اللہ معاف کرے، یہاں کلام کے سمجھنے میں بعض اکابر سے تسامحات ہوگئے ہیں۔ فرشتوں کا قول بہ طور اعتراض یا گستاخی کے نہ تھا۔ فرشتے تو گستاخی کر ہی نہیں سکتے۔ ''باغی فرشتوں'' کا تخیل تمام تر مسیحی ہے اور عجب نہیں کہ مسیحیوں کے ساتھ تعلقات قائم ہو جانے سے یہ خیال مسلمان علماء میں گھر کر گیا ہو۔ فرشتوں کا یہ قول تمام تر وفور نیاز مندی، اقرار وفاداری اور جوش جاں نثاری کا نتیجہ تھا، جیسا کہ ہمارے بعض محققین نے صراحۃً سمجھا ہے۔(۱۱)

سورۃ الانعام آیت ۷۷ میں ہے: فَلَمَّا رَأَى الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هَـٰذَا رَبِّي هَـٰذَآ أَكْبَرُ فَلَمَّا أَفَلَتْ قَالَ يَا قَوْمِ إِنِّي بَرِيءٌ مِّمَّا تُشْرِكُونَ.(ترجمہ: پھر جب سورج کو چمکتے ہوئے دیکھا، تو بولے یہی میرا پروردگار ہے، یہی سب سے بڑا ہے، لیکن جب وہ بھی غروب ہو گیا، تو بولے اے لوگو! میں اس شرک سے بری ہو اور بیزار ہوں جو تم کیا کرتے ہو)۔ اس کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے:

......میں اس شرک میں شریک کیا ہوتا، الٹا اس سے بیزار ہوں......ھذا ربی ھذا اکبر۔ سورج دیوتا کی پوجا دنیا میں ہمیشہ بڑی دھوم دھام سے بڑے زوروں پر ہوا کی ہے اور اہل کلدانیہ شمس پرستی میں امتیاز خاص رکھتے تھے۔

اس کے بعد مولانا دریابادیؒ اس موقع پر لکھتے ہیں:

ھذا ربی: تینوں موقعوں پر حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام کی زبان سے مشرکوں کی ترجمانی رب سے کرائی گئی ہے۔ الٰہ یا اور کوئی لفظ وارد نہیں ہوا ہے۔ جاہلی قوموں کو سب سے زیادہ

---

(۱۰) ماخذ سابق، ص۳۷

(۱۱) ماخذ سابق، ص۹۶

ٹھو کر صفت ربوبیت ہی پر لگی ہے، اور یہی دھوکا آج تک چلا آرہا ہے۔[۱۲]

ایسے ہی سورۃ المائدۃ آیت ۱۱۷ (فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنتَ أَنتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ) کی تفسیر محققانہ انداز میں کی ہے جس کے بارے میں مولانا عبد اللہ عباس ندویؒ کہتے ہیں کہ "مولانا دریادیؒ نے اس کا ترجمہ ایسا کر دیا ہے، جو اپنی جگہ بالکل صحیح ہے اور قادیانیت کی ساری دیوار منہدم ہو جاتی ہے":

فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنتَ أَنتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ یعنی جب تونے مجھے دنیا سے اٹھالیا، اس کے بعد مجھے کچھ خبر نہیں۔ "توفیتنی" دونوں مفہوموں کو شامل ہے، زندہ آسمان پر اٹھائے جانے کو بھی اور دوبارہ اپنے وقت اصلی پر وفات کو بھی۔[۱۳]

تفسیر میں سلف کی پیروی: مولانا دریابادیؒ زیادہ تر تفسیر کرتے وقت علمائے سلف کی تفسیروں کو ترجیح دیتے ہیں۔ چنانچہ سورۃ البقرۃ کی مذکورہ آیت کی تفسیر میں لکھا ہے:

بہترین تقریر اس سلسلہ میں وہ ہے جو ہمارے شیخ وقت، مفسر تھانویؒ نے کی ہے، وہ ذیل میں بجنسہ نقل ہے:

۔۔۔خلاصہ یہ کہ جب کام کرنے والوں کا ایک گروہ موجود ہے تو ایک نئی مخلوق کو جن میں کوئی کام کا ہوگا، کوئی نہ ہوگا، اس خدمت کے لئے تجویز فرمانے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ بطور اعتراض کے نہیں کہا، نہ اپنا استحقاق جتلایا، جو ان مقدس خدمت گاروں پر شبہات پیدا ہوں، بلکہ یہ ایسی بات ہے کہ کوئی حاکم نیا کام تجویز کر کے اس کے لئے ایک مستقل عملہ بڑھانا چاہے اور اپنے قدیمی عملہ سے اس کا اظہار کرے، وہ لوگ اپنی جاں نثاری کی راہ سے عرض کریں کہ حضور جو لوگ اس کام کی تجویز کے لیے تجویز ہوئے ہیں، ہم کو کسی طرح تحقیق ہوا ہے کہ بعض بعض تو اس کو بخوبی انجام دے سکیں گے اور بعض بالکل ہی کام بگاڑ دیں گے، جن سے حضور کا مزاج ناخوش ہوگا، آخر ہم کس مرض کی دوا ہیں، ہر وقت حضور پر جان قربان کرنے کو تیار ہیں اور حضور کی جان و مال کو دعا دیتے رہتے ہیں۔۔۔اسی طرح فرشتوں کی عرض و معروض اظہار نیاز مندی کے واسطے تھی اور

---

[۱۲] تفسیر ماجدی جلد دوم، مجلس تحقیقات و نشریاتِ اسلام لکھنؤ ۲۰۰۰ء، ص ۵۹

[۱۳] تفسیر ماجدی جلد اول، ص ۹۹۵

یہ بات کسی طرح ان کو اللہ تعالیٰ نے معلوم کرادی ہوگی کہ بنی آدم میں برے بھلے سب ہی طرح کے ہوں گے۔[۱۴]

تفسیر ماجدی میں بعض آسمانی کتابوں سے استفادہ: مولانا دریابادیؒ نے حسب موقع آسمانی کتابوں سے استفادہ کیا ہے۔ خصوصاً اپنی انگریزی تفسیر میں یہود نصاریٰ کے رد میں اس طرف خاص توجہ دی ہے اور مستشرقین کے سامنے قرآن مجید کی حقانیت کو ثابت کرنے کے لیے ان کی مذہبی کتابوں سے بے شمار اقتباسات نقل کرکے انہیں خاموش ہونے پر مجبور کردیا۔ اسی طرح اپنی اردو تفسیر میں بھی اس کا مظاہرہ جگہ جگہ کیا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ ان آیات کی تشریح و تفسیر سے وہ شبہات کافور ہو جاتے ہیں جو اسرائیلی روایات نے پیدا کر دیے تھے اور روشن خیال علماء کی قلعی کھل جاتی ہے، جو تدبر سے عاری ہیں اور اس بارے میں وہ مستشرقین کے ہم نوا بن جاتے ہیں۔

تفسیر ماجدی میں بعض سائنسی مباحث: اس تفسیر کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ اس میں عصری تقاضوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اسی کے پیش نظر اس میں آفاق و انفس پر دلالت کرنے والی آیات کا سائنسی تجزیہ کیا گیا ہے۔ اس تجزیے میں کہیں وہ سائنس سے مرعوب ہوتے نظر نہیں آتے، بلکہ وہ سائنس کی تیز رفتار ترقیوں و تبدیلیوں پر مثبت تنقید کرتے ہوئے اس سے استفادہ کرتے ہیں۔ ایک دو مثالوں سے مولانا کے سائنسی موقف کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ سورۃ البقرۃ ۲۹ (هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الأَرْضِ جَمِيعاً) کی تشریح ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> مرتبۂ انسانی کا شرف واحترام اسلام ہی کا قائم کیا ہوا ہے۔ ڈارون کے ترقی یافتہ بندر غریب کو اس رتبہ و مقام سے کیا واسطہ! ارتقائے کائنات کا اصل الاصول بالکل صحیح مان لیا جائے، جب بھی اس کی ڈارونی تعبیر کی گمراہی تو بدستور رہے گی۔[۱۵]

ایسے ہی مولانا دریابادیؒ نے ''سبع سماوات'' (البقرۃ آیت ۲۹) کی تفسیر ان الفاظ میں کی ہے:

---

[۱۴] حوالہ سابق ص ۹۶۔۹۷

[۱۵] ماخذ سابق، ص ۶۲

قدیم اہل ہیئت نے سات آسمانوں سے مراد سات مشہور سیاروں کے مدار لیے ہیں...جدید ترین فلکیاتی تحقیق کے مطابق جو بھی تشریح کی جائے، قرآن سے باہر نہیں بلکہ قرآن کے اندر ہی ہوگی۔

امام رازی (۱۱۵۰-۱۲۱۰ء) کی "تفسیر کبیر" کی طرح مولانا دریابادی نے گنجینۂ معانی کی کثرت کے علاوہ عقلی شواہد جگہ جگہ پیش کیے ہیں۔ اس طرح مولانا دریابادیؒ کی تفسیر میں سائنسی علوم کے علاوہ ریاضی، منطق، فلسفہ، تاریخ اور جغرافیائی علوم کے بھی قیمتی معلومات و حواشی ملتے ہیں۔

مولانا دریابادیؒ کے انگریزی ترجمہ و تفسیر کا پس منظر: ہندوستان میں عرصے سے ایک انگریزی ترجمۂ قرآن کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ ماہنامہ الندوہ اپریل ۱۹۱۰ء سے معلوم ہوتا ہے کہ ندوۃ العلما کا تیرہواں اجلاس دہلی مارچ ۱۹۱۰ء میں منعقد ہوا تھا۔ اس میں ہندوستان میں پہلی بار انگریزی ترجمۂ قرآن مجید کے بارے میں صدا بلند ہوئی تھی۔

مولانا عبدالماجد ریابادی کے انگریزی ترجمے سے قبل ہندوستان میں مارماڈیوک پکتھال اور عبداللہ یوسف علی وغیرہ کے تراجم قرآن شائع ہو چکے تھے، اس کے باوجود ایک ایسے انگریزی ترجمے کی ضرورت شدت سے محسوس ہو رہی تھی جو اہل سنت والجماعت کے مسلک کے مطابق ہو، اس کے لیے قرعۂ فال مولانا دریابادی کے نام نکلا۔

مولانا دریابادیؒ کا انگریزی ترجمہ و تفسیر چار جلدوں میں پہلی بار دارالاشاعت، کراچی نے ۱۹۴۱ء میں شائع کیا۔ بعد میں اس ترجمے کو مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے مجلس تحقیقات و نشریات لکھنؤ سے ۱۹۸۱ء-۱۹۸۵ء کے دوران شائع کرایا۔ مولانا ندویؒ کی خواہش پر اسلامک فاؤنڈیشن لیسٹر نے ۲۰۱۱ء میں اسے ایک جلد میں شائع کیا۔ اس پر نظر ثانی کا کام پروفیسر عبدالرحیم قدوائی نے کیا۔[۱۶]

علوم القرآن اور مولانا دریابادیؒ: مولانا دریادی کا تعلق قرآن مجید سے بڑا گہرا تھا۔ اسی بنا پر انہوں نے قرآن مجید کی انگریزی و اردو تفسیر قرآن لکھنے کے بعد اس طرف بھی توجہ مبذول کی۔ اس پس منظر کے متعلق وہ کہتے ہیں:

---

[۱۶] ماخذ سابق، ص ۸۲

قرآن مجید کی خدمت علمی رنگ میں کرنے کے لیے تو ابھی بہت سے عنوانات پڑے ہوئے ہیں۔۔۔ چنانچہ ایک رسالہ اس سے قبل الحیوانات فی القرآن یا حیوانات قرآنی کے نام سے مرتب ہو کر شائع بھی ہو چکا ہے۔[۱۷]

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۵۵ء میں مکتبہ ندوۃ المعارف بنارس نے شائع کیا۔ اس کی ترتیب حروف تہجی کے انداز پر ہے۔ اِبل سے شروع ہوئی ہے۔ یمسکھن پر ختم ہوئی ہے۔ یہاں پر ھنّ کی ضمیر طیور یعنی پرندوں کے لیے لائی گئی ہے۔ اس کی تشریح مولانا یوں کرتے ہیں:

پرندوں کی پرواز کی اعلیٰ مشینری پر قرآن مجید نے بار بار زور دیا ہے۔ اور یہ راز اب بیسویں صدی عیسوی میں جا کر کھلا کہ اسی قدرتی مشینری کی نقالی اور تقلید سے اعلیٰ ترین، مشینوں، طیاروں، ہوائی جہازوں، ہوائی کلوں، ہوائی گھوڑوں کی ایجاد کی جا سکتی ہیں۔[۱۸]

اس کے بعد اس سلسلے کی دوسری کتاب مولانا دریابادیؒ نے جغرافیۂ قرآنی یا ارض القرآن کے نام سے جولائی ۱۹۵۵ء میں لکھی۔ راقم کے پیش نظر اس کا تیسرا ایڈیشن ہے، جو مئی ۲۰۰۱ء میں شائع ہوا ہے۔ اس کتاب میں کل ۹۶ صفحات ہیں۔ یہ اپنے موضوع پر ایک جامع اور معلوماتی کتاب ہے۔ اس کتاب کی ترتیب بھی آسانی کے پیش نظر حروف تہجی کے انداز پر ہے۔ اس کی ابتداء "اثنتا عشرة عينا" سے ہوا ہے۔ اس سے مراد وہ بارہ چشمے ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دشتِ سینا میں ایک چٹان پر حکم الٰہیٰ سے اپنے عصا سے ضرب لگانے سے پھوٹے پڑے تھے۔ اور کتاب کا اختتام "یم" پر ہوا، جس کے معنی سمندر کے ہیں، اس سے مراد بحر احمر ہے جس میں فرعون مع لشکر غرقاب ہوا تھا۔ اس کے علاوہ اس سے مراد دریائے نیل وغیرہ بھی ہیں جیسا کہ مختلف آیات سے اس کی وضاحت ہوتی ہے۔

اس سلسلے کی تیسری کتاب "اَعلام القرآن یا قرآنی شخصیات" ہے جس میں جن شخصیتوں (بشری،

---

(۱۷) مولانا عبد الماجد دریابادی، جغرافیۂ قرآنی۔ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، ندوۃ العلماء، لکھنؤ، ۲۰۰۱ء، ص ۹

(۱۸) الحیوانات فی القرآن، ندوۃ المعارف بنارس، جون ۱۹۵۵ء، ص ۱۶۶-۱۶۷

جنی، ملکی) کا ذکر قرآن مجید میں صراحتاً یا کنایۃً آیا ہے، ان کا لغت کے انداز میں ذکر ہے۔ اصحاب الکھف والرقیم (غار اور کتبے والے) کی تشریح تاج العروس وغیرہ کے حوالے سے یوں کی گئی ہے: ”اصحاب کہف کے مزار پر ایک برنجی تختی لگادی گئی تھی، جس پر ان کے نام، نسب اور مختصر حالات درج تھے، اور اصحاب کہف اسی مناسبت سے اصحاب الرقیم بھی کہلائے“۔[۱۹]

حاشیہ نگاری: تفسیر ماجدی میں جو افادات و تحقیقات بکھری ہوئیں تھیں، اس کو مولانا عبد اللہ المبارک ندوی نے جمع کر دیا ہے اور اس کا نام افادات تفسیر ماجدی رکھا ہے۔ اس کو پہلی بار حمیرا فاؤنڈیشن دربھنگہ (بہار) سے ۲۰۱۲ء شائع کیا گیا۔ اس میں کل ۵۳۶ صفحات ہیں۔

تفسیر ماجدی کے بارے میں بعض ممتاز اہل علم کی رائیں: قاری محمد طیبؒ اسے ایک شاہ کار تفسیر قرار دیتے ہیں اور اسے تمام علم دوست اور نو تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لئے مفید سمجھتے ہیں کیوں کہ ان کی نفسیات کو مدنظر رکھ کر اسے لکھا گیا ہے۔ قاری صاحب کے نزدیک تفسیری ماجدی کی دو اہم خصوصیات یہ ہیں کہ یہود و نصاریٰ سے متعلق آیات جن کی طرف قرآن مجید میں اشارے یا اجمال سے کام لیا گیا ہے، ان کی وضاحت کے لئے اس تفسیر میں بقدر ضرورت تاریخی تفصیل بیان کر دی گئی ہے۔ دوسرے یہ کہ اس میں تورات، انجیل اور قرآن مجید کی تعلیمات کا تقابلی ایسا موازنہ پیش کیا گیا ہے، تاکہ اس کے ذریعے قرآنی مقاصد کی بالادستی اور برتری سامنے آجائے۔ ان دونوں پہلوؤں سے اس تفسیر کی امتیازی حیثیت مسلم ہے۔[۲۰]

مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ: علمی، تحقیقی اور ادبی حیثیت سے تفسیر ماجدی مولانا کا وہ عظیم الشان کارنامہ ہے، جس کی آب و تاب وقت گزرنے کے ساتھ اور بڑھے گی اور آئندہ نسلیں شکر گزاری کے ساتھ انہیں یاد کریں گی۔[۲۱]

---

[۱۹] اعلام القرآن، نیو کریسنٹ پبلشنگ کمپنی، ۱۹۹۸، ص۳۹-۴۰

[۲۰] صدق جدید لکھنؤ۶، جنوری ۱۹۷۳ء، بحوالہ ہند و پاک کے مشاہیر کی قرآنی خدمات، ڈاکٹر ضیاء الدین فلاحی، ۲۰۲۰ء، ص۴۸

[۲۱] ماہ نامہ برہان، دہلی، جنوری ۱۹۷۰، بحوالہ ہند و پاک کے مشاہیر کی قرآنی خدمات، ص۴۹

مولانا محمد ادریس ندوی بلگرامیؒ: اس میں مفردات قرآن کی تحقیق، ادبی لطائف اور کلامی مباحث کی تشریح کے علاوہ جدید تعلیمی طبقے کے لئے مفید ہے۔ مفرداتِ قرآن کی تحقیق، نحوی مشکلات پر تنبیہ، ادبی لطائف کا ذکر، کلامی مباحث کی ضروری تشریح، تاریخی واقعات پر مستند معلومات، آیات سے مستنبط مسائل کی طرف اشارات، یہ امور اس تفسیر کی اہم خصوصیات میں سے ہیں۔ زبان کی سلاست اور روانی ان سب سے ماسوا ہے۔ پورے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا کہ اس دور میں جو اہم علمی خدمات انجام پائی ہیں، یہ تفسیر ان میں ایک ممتاز درجہ رکھتی ہے۔ اور ان شاءاللہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ، علماء اور مدارس عربیہ کے منتہی طلبہ، سب کے لئے مفید اور بے حد کارآمد ثابت ہوگی۔[۲۲]

مولانا ابو الحسن علی ندویؒ : تفسیر ماجدی کی عصری معنویت اپنی جگہ مسلم ہے۔ اس تفسیری خدمت انجام دینے کے لئے جو صفات درکار تھیں، ان میں موجود تھیں اور اس کام کے لیے وہ موزوں ترین تھے:

> اب یہ نیا دور تھا، عقلی علوم اور فلسفۂ یونان کے بجائے تجربی علوم، سائنس بالخصوص طبیعیات کا دور دورہ تھا۔ ہر شعبے میں نئے نئے اکتشافات و تحقیقات ہو رہی تھیں۔ تاریخ وجغرافیہ کے علم نے وہ اہمیت حاصل کر لی تھی جو انہیں کبھی حاصل نہیں ہوئی تھی...... اس سب سے عالمِ اسلام بالخصوص اس کے علمی طبقے پر ایک نئی ذمہ داری عائد ہوتی تھی۔ اب ان جدید معلومات و تحقیقات کی روشنی میں اعجاز قرآن اور صداقت قرآنی کو اسی طرح عیاں اور عالم آشکارا کرنا تھا جیسا قدیم علماء و متکلمین اور مفسرین قرآن کو اپنے زمانے میں یونانی فلسفہ اور حکمت اور الحاد و باطنیت کا مقابلہ کرنا پڑا تھا اور انھوں نے علمی اور عقلی دلائل سے قرآن مجید کی حقانیت کو ثابت کیا تھا۔[۲۳]

نقد و تبصرہ:

۱۔ تفسیر ماجدی اردو سات جلدوں پر مشتمل ہے اور انگریزی چار جلدوں میں ہے۔

---

[۲۲] ماخذ سابق ص۴۸-۴۹

[۲۳] تفسیر ماجدی، جلد سوم، ۲۰۰۲ء، ص۵

۲۔ مولانا کی انگریزی تفسیر "تفسیر القرآن" عصری تفسیروں میں اپنا ایک مقام رکھتی ہے۔ ۱۹۳۹ء میں معروف سائنسی تحقیقات فاضل مفسر کے پیش نظر تھیں۔ اب جدید سائنس کی روشنی میں ضرورت ہے کہ اس پر نظر ثانی کی جائے تا کہ اس کا نفع مزید عام ہو۔ اس تفسیر میں کم و بیش پونے تین سو حواشی ہیں۔ انھیں جدید تقاضوں کے مطابق شائع کر دیا جائے تو مناسب ہو گا۔

۳۔ مولانا کی اردو تفسیر کے مخاطب مسلمان ہیں۔ ان کی انگریزی تفسیر اردو تفسیر کا ترجمہ نہیں ہے بلکہ مولانا کے پیش نظر مغربی محققین، مستشرقین اور جدیدیت سے مرعوب مسلمانوں کی ذہنیت تھی اور انہیں کے لیے قرآن مجید کی ایمان افروز اور دل نشین تشریح کی گئی ہے، تا کہ قرآن کا پیغام ان تک پہنچ سکے۔

۴۔ ان کے نواسے پروفیسر عبد الرحیم قدوائی نے انگریزی تفسیر کی چار جلدوں کو سامنے رکھ ایک جلد میں اس کی تلخیص کی ہے اور اسے ۲۰۰۱ء میں اسلامک فاؤنڈیشن لندن نے شائع کیا۔ اور ۲۰۰۶ء میں اسی کی کاپی صدق فاؤنڈیشن لکھنؤ نے شائع کی ہے۔

مراجع: مولانا دریابادی ایک کثیر المطالعہ عالم دین تھے۔ انھوں نے اپنے ترجمہ وتفسیر میں اردو اور عربی کے سینکڑوں مراجع سے استفادہ کیا ہے۔ ان میں عربی اور اردو کے لغات، لغات القرآن، اعراب القرآن، عربی، اردو کی بے شمار تفسیروں کے علاوہ تورات وانا جیل وغیرہ سے بھرپور استفادہ شامل ہے۔ تقریباً پانچ صفحات میں مراجع کی فہرست دی گئی ہے۔

حرف آخر: مولانا دریابادیؒ اپنے ہم عصروں میں ایک ممتاز شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ایک بلند پایہ ادیب، جامع کمالات شخصیت کے مالک تھے۔ چنانچہ اس کے نتیجے میں وہ اردو انگریزی زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ وتفسیر لکھنے میں کامیاب ہوئے۔ اس کے علاوہ انھوں نے علوم القرآن پر کئی اہم رسالے تحریر کیے مثلاً: اَعلام القرآن، الحیوانات فی القرآن، جغرافیۂ قرآنی وغیرہ۔ اعلام القرآن کے دیباچے میں انھوں نے "الاعداد فی القرآن" کا نام لیا ہے لیکن یہ کتاب منصۂ شہود پر نہ آسکی۔

اسلامی ڈیموکریسی، راشد غنّوشی کی نظر میں

سعیدہ شریف

ڈیموکریسی، اسلام اور جدیدیت، معاصر اسلامی فکر کا مستقل مسئلہ رہا ہے۔ اس کے جوابات بھی مختلف اسلامی تحریکوں نے الگ الگ طریقے سے دیے ہیں۔ ان جوابات میں مفکرین اور محققین نے اسلامی تحریکوں کی حد بندی کی ہے۔ کچھ اسلامی مفکرین کہتے ہیں کہ اسلام اور ڈیموکریسی میں توافق پیدا کیا جاسکتا ہے جبکہ دوسرے اسلامی مفکرین کا خیال ہے کہ ڈیموکریسی وہی جس کا ذکر قرآن میں ''شوری'' کے نام سے آیا ہے۔ یہ لوگ حدیث نبوی اور بعض فقہی آراء سے استناد کرتے ہیں جس کی رو سے ''شوری'' واجب ہے۔ انہیں میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ڈیموکریسی اور شوری ایک ہی چیز ہے۔ یہ لوگ دستور مدینہ سے استدلال کرتے ہیں کہ وہ انسانی تاریخ میں مشترک شہریت کا پہلا معاہدہ تھا کیونکہ اس میں انصاف، تعددیت اور اقلیتوں کی حفاظت کی بات کی گئی تھی نیز یہ کہا گیا تھا سب مسلمان ایک امت کا حصہ ہیں۔

اس کے برخلاف اسلامی مفکرین کی ایک جماعت ایسی بھی ہے جو کہتی ہے کہ ڈیموکریسی اور اسلام ایک دوسرے کی ضد ہیں اور دونوں جمع نہیں ہوسکتے ہیں۔ یہ لوگ دو جماعتوں میں تقسیم ہو گئے ہیں: ایک روایت پسند ہے اور دوسرا اجہادی ہے اور یہ دونوں قرآن اور سنت سے اپنے موقف کا استشہاد کرتے ہیں کہ حکم (حق حکومت) اللہ کا ہے، عوام کا نہیں ہے اور قانون سازی کا حق صرف اللہ کو ہے، پارلیمنٹ کو نہیں ہے۔ پہلے فریق کا کہنا ہے کہ ڈیموکریسی اسلام کے سیاسی طاقت اور حکومت کے تصور سے ٹکرا رہی ہے جبکہ دوسرا فریق فقہی تعارض سے آگے بڑھ کر عقیدے کی بات کرتا ہے کہ ڈیموکریسی کفر ہے بلکہ وہ اسے موجودہ زمانے کا ''طاغوت'' کہتا ہے۔

یہ آراء اور تصورات قابل تبدیلی اور ناقابل تبدیلی اعتقادات پر مبنی ہیں جو سوسائٹی کے بدلتے ہوئے سیاسی فکر و آئیڈیالوجی سے متاثر ہیں اور جو دنیا بھر میں ڈیموکریسی کے پچھلی صدی کے آٹھویں

دہے سے چلن کا نتیجہ ہے۔ ان آراء کی وجہ سے عربی اور دوسری زبانوں میں بہت کچھ چھپا ہے جو فکری تجدید، جدیدیت، ڈیموکریسی، لبرلزم اور سیاسی اسلام وغیرہ پر روشنی ڈالتا ہے۔

یہ سلسلہ "عرب بہاریہ" کے بعد مزید تیز ہو گیا ہے جس کے بعد عرب قومیں آزادی، عزت، برابری، ڈیموکریسی اور سیاسی زندگی میں خواتین کی حصے داری کا مطالبہ کر رہی ہیں۔ ان مسائل پر لکھنے والوں میں عالم اسلام کے کچھ مشہور سیاسی رہنما اور مجتہد لوگ شامل ہیں۔ مثلاً سوڈان کے سیاسی و دینی مفکر اور قائد ڈاکٹر حسن عبد اللہ الترابی (م: ۲۰۱۶) جنہوں نے "السیاسة و الحكم: النظم السلطانية بين الأصول وسنن الواقع" سنہ ۲۰۰۳ میں اس وقت لکھی جب وہ سوڈان کی حکومت کے ساتھ اختلاف کی وجہ سے جیل میں بند تھے حالانکہ اسی حکومت کو لانے میں ان کا بڑا ہاتھ تھا۔ انھیں میں تونس کی تحریک نہضہ کے قائد راشد الغنوشی بھی شامل ہیں جو اپنے ملک میں سیاسی اختلاف کی وجہ سے ۲۰۲۳ سے جیل میں بند ہیں۔ انہوں نے الحریات العامۃ فی الدولۃ الاسلامیۃ نامی کتاب لکھی جس کی پہلی جلد ۱۹۹۳ میں شائع ہوئی اور دوسری جلد ۲۰۱۲ میں شائع ہوئی۔ انہوں نے الديمقراطية وحقوق الانسان فى الاسلام بھی لکھی جو مرکز الجزیرۃ برائے تحقیق اور الدار العربیۃ سے ۲۰۱۲ء میں شائع ہوئی۔

غنوشی اور اسلامی ڈیموکریسی: راشد غنوشی نے اپنی ۲۰ سے زیادہ کتابوں میں اسلام میں آزادی اور ڈیموکریسی کے بارے میں اپنے موقف پر اظہار خیال کیا ہے۔ اسی کے ساتھ انہوں نے ان افکار کو سیاسی طور پر تونس میں پرکھا بھی ہے، جس کی وجہ سے عرب اور مغربی محققین کی نظر ان کی آراء پر مرکوز ہوئی ہیں۔ انہوں نے غنوشی کے بارے میں اتنا کچھ لکھا ہے جو کسی اور معاصر مسلم سیاسی مفکر کے بارے میں نہیں لکھا گیا ہے۔ ان میں جدید ترین کوشش امریکہ کی میساچوسٹس یونیورسٹی میں سیاسیات کے پروفیسر آنڈرو مارچ کی ہے جنہوں نے غنوشی کے ساتھ مل کر ان کے بارے میں On Muslim Democracy: essays and dialogues کے عنوان سے کتاب لکھی ہے جو آکسفورڈ یونیورسٹی پریس سے شائع ہوئی۔ اس کتاب میں امریکی پروفیسر نے غنوشی کے متعدد عربی مقالوں کا انگریزی ترجمہ کیا ہے۔ کتاب میں غنوشی کے ساتھ ایک طویل انٹرویو بھی شامل ہے

جس میں انھوں نے اپنے فکری اور سیاسی سفر اور بڑی تبدیلیوں کے بارے میں بات کی ہے اور بتایا ہے کہ وہ کیسے ''اسلامی ڈیمو کریسی'' سے ''مسلم ڈیمو کریسی'' تک پہنچے اور سیاسی اسلام سے ان کا کیا تعلق رہا ہے۔ یہ ۲۸۴ صفحات پر مشتمل کتاب ہے۔ اس کے بارے میں پچھلے ۱۸/ مارچ کو پروفیسر مارچ نے سلا (مراکش) میں اسلام اور ڈیمو کریسی کے بارے میں ایک کانفرنس[1] میں اظہار خیال کیا جس میں ممتاز اہل قلم، سیاسی رہنما اور اہل فکر لوگ شریک تھے۔ اس موقعے پر غنوشی کے ایڈوائزر برائے امور خارجہ رضا ادریس بھی موجود تھے۔

پروفیسر مارچ نے کہا کہ کتاب لکھنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ حکومت اور آزادی کے متعلق اسلامی افکار سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ شیخ غنوشی کی کتاب الحریات العامۃ فی الدولۃ الاسلامیۃ (اسلامی حکومت میں عمومی آزادیاں) کے پڑھنے کے بعد ان سے ''استخلاف''[*] کے بارے میں مزید بات کرنے کی خواہش ہوئی کیونکہ اسلامی سیاسی فکر میں یہ ایک بنیادی مقام رکھتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ وہ سمجھنا چاہتے تھے کہ کس طرح تقلیدی ''خلافت'' کا نظریہ عصری ڈیمو کریٹک تبدیلیوں سے متاثر ہوا ہے، بالعموم عرب اور اسلامی ممالک میں عرب بہاریہ کی وجہ سے جو حالات پیدا ہوئے اور بالخصوص تونس میں جہاں سے عرب بہاریہ کی پہلی چنگاری سنہ ۲۰۱۱ میں پھوٹی تھی۔

تحریک نہضہ: پروفیسر مارچ نے اپنے مقدمے میں کتاب لکھنے کے دوافع کا ذکر کیا ہے۔ اس کی ابتداء انہوں نے ییل یونیورسٹی کے تعاون سے غنوشی کی کتاب ''اسلامی اسٹیٹ میں عمومی آزادیاں'' کے ترجمے سے کیا۔ اس کے بعد انہوں نے غنوشی سے ملاقات کی اور تونس کے ڈیمو کریٹک تجربے کے بارے میں لکھا، جس کی کامیابی میں غنوشی کا بڑا ہاتھ تھا۔ عرب بہاریہ کی تونس میں کامیابی کے بعد ڈیمو کریٹک تبدیلی میں غنوشی کا بڑا حصہ تھا۔ اس عرصے میں انہوں نے اس وقت کے صدر جمہوریہ الباجی قائد السبسی کے ساتھ مل کر کام کیا۔

---

[1] یہاں کانفرنس میں بولنے والے دوسرے شرکاء کی آراء کا ترجمہ نہیں کیا گیا ہے بلکہ صرف پروفیسر مارچ کے خطاب اور ان کی کتاب سے متعلق حصوں کا ہی ترجمہ کیا گیا ہے۔

[*] اللہ کا انسانوں کو زمین پر اپنا خلیفہ بنانا یا سیاسی تمکین۔

دوسری اسلامی تحریکوں کے برخلاف، تحریک نہضہ نے اپنے سیکولر معاندین کے لئے بہت کچھ تنازل کیا تاکہ تونس میں سیاسی استقرار قائم رہے۔ تحریک نہضہ اس سے بھی آگے بڑھ کر، واضح طریقے سے الیکشن جیتنے کے باوجود، ایک ٹکنوکریٹ[۲] حکومت کے حق میں سیاسی اقتدار سے دست بردار ہو گئی۔ یہی نہیں بلکہ تونس کے آئین بننے کے تین سال بعد مئی ۲۰۱۶ میں تحریک نہضہ نے کافی اندرونی بحث و مباحثہ کے بعد اپنی دسویں کانفرنس میں اعلان کیا کہ وہ "سیاسی اسلام" سے آگے بڑھ کر اب اپنی سیاسی فکر کو "مسلم ڈیموکریسی" کا نام دیتی ہے۔

اسی کے ساتھ تحریک نہضہ نے مسلم ڈیموکریٹس کو دعوت دی کہ وہ ایک صحیح راستہ اپنانے کے لئے ڈائیلاگ شروع کریں تاکہ اسلام اور جدیدیت میں کوئی تناقض نہ باقی رہے۔ اس نئی سوچ کے بارے میں حالات پر نظر رکھنے والوں کا تجزیہ تھا کہ اس کے ذریعے تحریک نہضہ نے خود کو اپنے اس تاریخی اور نظریاتی نہج سے الگ کر لیا ہے جس پر وہ شروع سے کاربند تھی۔ پروفیسر مارچ نے کہا کہ غنوشی کی گرفتاری اور ان کے ساتھ ابتک کا معاملہ تونس میں ڈیموکریٹک تجربے کو پیچھے لے جانے والا قدم ہے۔ یہ صورت حال اس چیلنج کو واضح کرتی ہے جو اسلامی ڈیموکریسی کو نہ صرف سیاسی تجربے کے طور سے بلکہ ایک فکر کے طور پر بھی درپیش ہے جبکہ اسلامی ڈیموکریسی اسلامی فریم ورک میں تعددیت اور آزادی پر یقین رکھتی ہے۔ پروفیسر مارچ نے کہا اس سے پہلے بھی "اسلامی ڈیموکریسی" کے بارے میں لکھا گیا ہے لیکن ان کی کتاب انگریزی میں اس موضوع پر پہلی کتاب ہے جس میں بنیادی نصوص کو اور تحریک نہضہ کو پیش کیا گیا ہے جس نے تقلیدی سیاسی اسلام سے تجاوز کر کے "مسلم ڈیموکریسی" کے مفہوم کی وضاحت کی ہے۔ یہ مفہوم تقلیدی اسلامی سیاسی فکر سے آگے بڑھ کر ایک قدم ہے۔

اسلام اور ڈیموکریسی کے درمیان تعلق

- کیا مسلم ڈیموکریسی صرف ایک سیاسی اصطلاح ہے یا وہ ایک مکمل فکر ہے جو سیاسی اسلام سے آگے کا ایک قدم ہے؟

---

[۲] ٹیکنوکریٹ حکومت میں سیاسی لوگوں کے بجائے مختلف میادین میں تجربہ کار لوگوں کو وزارتی عہدے دیے جاتے ہیں۔

۔ کیا مسلم ڈیمو کریسی سیاست کے بارے میں ایک اسلامی آئیڈیالوجی ہے یا نظریہ ہے؟

۔ مسلم ڈیمو کریسی کس طرح سابقہ اسلامی سیاسی نظریہ یا اسلامی ڈیمو کریسی کے سابقہ تصور سے الگ ہے؟

۔ مسلم ڈیمو کریسی کس طرح غیر اسلامی ڈیمو کریٹک نظریات سے الگ ہے جو تعددیت اور پارلیمانی ڈیمو کریسی پر یقین رکھتے ہیں؟

۔ کیا یہاں معاملہ صرف الیکشن کے زمانے میں سیاسی مارکیٹنگ کا ہے یا یہ اسلامی ڈیمو کریسی کی مخالفت کرنے والی سیاسی پارٹیوں کے خلاف اسٹریٹیجک فیصلہ ہے۔

یہ وہ کچھ سوال ہیں جن پر پروفیسر مارچ نے اس کتاب میں گفتگو کی ہے اور اس کے لئے انہوں نے ''مسلم ڈیمو کریسی'' کی اصطلاح کی تفسیر کے لئے راشد غنوشی کے ۱۰ مقالات کا ترجمہ کیا ہے اور ان سے لمبی گفتگو بھی کی ہے جس سے اس نظریے کی وضاحت ہوتی ہے۔۔۔ اس گفتگو سے پچھلے چالیس سالوں کے درمیان غنوشی کی بحیثیت سیاسی لیڈر کے روشنی پڑتی ہے۔ انہوں نے اپنی سیاسی زندگی کی ابتدا ایک سیکولر اور قوم پرست لیڈر کے طور پر کی تھی اور دھیرے دھیرے نہضہ پارٹی کے ذریعے اسلامی تحریک میں شامل ہو گئے تھے۔ اس دوران ان کو پریشانیوں، گرفتاری اور تعذیب کا سامنا کرنا پڑا۔ پچھلی صدی کے نویں دہے میں ان کی پھانسی کا حکم دوبار صادر ہوا جس کی وجہ سے وہ سیاسی ریفیوجی کے طور پر ۱۹۸۹ سے لیکر ۲۰۱۱ تک لندن میں رہے کیونکہ ان کے خیالات اور نظریات ان کے مخالفین کو ناپسند تھے، خصوصاً اس لئے کہ انہوں نے ایک نیا فکری ماڈل پیش کیا تھا جس سے سیاسی اور اجتماعی تبدیلی کے خواہش مند مسلم ممالک کو راستہ نظر آتا ہے۔ اس کے برعکس غنوشی کے سیاسی دشمن، جن میں اسلام پسند اور سیکولر دونوں شامل ہیں، یقین رکھتے ہیں کہ سیاسی اسلام اور ڈیمو کریسی کو ایک دوسرے سے قریب لانا ناممکن ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ڈیمو کریسی کا اسلامی کرن یا اسلامی تحریکوں کا ڈیمو کریسی کرن ایک وقتی حربہ ہے تاکہ یہ لوگ حکومت پر قبضہ کر سکیں اور اس کے بعد یہ لوگ ڈیمو کریسی کے خلاف بغاوت کر کے تاریخی اسلامی خلافت جیسی حکومت قائم کریں گے۔ یہ لوگ یہ بات کہتے ہیں جبکہ تحریک نہضہ نے ڈیمو کریسی، سماجی امن

وسلامتی اور وطن کی خاطر حکومت میں سیاسی شرکت سے دوری بنائی تھی۔

پروفیسر مارچ کے خیال میں غنوشی صرف ایک سیاسی لیڈر نہیں ہیں بلکہ وہ ایک مفکر اور مجدد ہیں جنہوں نے اسلامی موروثات اور جدید ڈیموکریسی کے درمیان قربت تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس گفتگو سے سیاسی تعددیت، حقوق، آزادیاں، بالخصوص اعتقاد اور ضمیر کی آزادی، عوامی حکومت اور انصاف کے بارے میں غنوشی کے افکار واضح ہوتے ہیں۔

اسلامی ڈیموکریسی سے مسلم ڈیموکریسی کی طرف: تونس کا تجربہ دوسرے ممالک مثلاً ترکی، ملیشیا اور پاکستان وغیرہ سے مختلف ہے۔ ان کا تقابل راشد غنوشی کی فکر سے کرتے ہوئے پروفیسر مارچ اسلامی ڈیموکریسی اور مسلم ڈیموکریسی کے درمیان فرق واضح کرتے ہیں۔ اسلامی ڈیموکریسی اسٹیٹ پر ایک اسلامی ماڈل نافذ کرنا چاہتی ہے جبکہ مسلم ڈیموکریسی تعددیت کو ایک سیاسی حقیقت کے طور پر تسلیم کرتی ہے جس کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔ پروفیسر مارچ نے بتایا کہ تونس کے تجربے نے اس تبدیلی کو ایک حقیقت کے طور پر پیش کیا ہے جس کے تحت سیکولر، لبرل اور لفٹسٹ پارٹیوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس کی بنیاد پر ایک زیادہ لچکدار نہج اپنانا پڑتا ہے تاکہ سوسائٹی میں بہت سی مشکلات اور پھسلنے کے مواقع سے بچا جاسکے۔ اس کا بنیادی عنصر آزادی کا التزام ہے۔

غنوشی کے خیال میں ”آزادی صرف ایک لبرل قدر value نہیں ہے بلکہ وہ کسی اخلاقی اور دینی عمل کے لئے ایک بنیادی شرط ہے اور دینی فضیلت کو حقیقی آزادی کے بغیر نہیں حاصل کیا جاسکتا ہے“۔ اسی کے ساتھ غنوشی سیاسی تعددیت کا گہرے طور پر اعتراف کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں سیاسی تعددیت کوئی جادو کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ سیاست کی حقیقت کو سمجھنے کا مسئلہ ہے۔ انہوں نے اشارہ کیا کہ محمد ﷺ نے دستور مدینہ بنایا اور نافذ کیا جو اسلامی حکومت کی تاریخ میں پہلا سِوِل دستور تھا۔ غنوشی کے خیال میں دستور مدینہ تعددی حکومت کا ماڈل تھا جس میں سوسائٹی کے مختلف عناصر سِوِل مصلحتوں کی بنیاد پر حکومت بناتے ہیں، نہ کہ دینی یا عقیدے کی بنیاد پر۔

پروفیسر مارچ کا کہنا ہے کہ برسوں کے سیاسی سفر کے دوران غنوشی طوباوی (خیالی، مثالی)

مرحلے سے نکل کر سیاسی واقعیت کے مرحلے میں داخل ہوئے اور ان کی سوچ زیادہ واضح ہو گئی کیونکہ انہوں نے تجربے سے پایا کہ سیاست میں مثالیت نہیں چلتی ہے بلکہ مصلحتوں کے درمیان موافقت پیدا کرنی ہوتی ہے اور نقصانوں کو کم کیا جاتا ہے۔ اس سفر کے دوران غنوشی اسلام پسندوں اور سیکولر لوگوں کے درمیان تعلقات کے بارے میں اس مرحلے تک پہنچے جس میں سیاسی کشمکش کو دینی نقطۂ نظر سے نہیں دیکھا جاتا ہے، جس میں لوگوں کے درمیان دوست اور دشمن، متدین اور کافی سمجھ کر تفریق نہیں کی جاتی ہے بلکہ مسلم ڈیموکریسی کے دائرے میں ڈیموکریسی کے مخالف کو "دشمن" سمجھا جاتا ہے چاہے وہ شخص اسلام پسند ہو یا سیکولر، اور "دوست" اس کو سمجھا جاتا ہے جو ڈیموکریسی پر یقین رکھتا ہے چاہے وہ نظریاتی طور پر کسی بھی بات پر یقین رکھتا ہو۔ دوستوں میں وہ شامل نہیں ہیں جو ڈکٹیٹر شپ یا سیاسی استبداد پر یقین رکھتے ہوں یا غیر ملکی طاقتوں کے بل پر کھڑے ہوں۔

پروفیسر مارچ کے خیال میں مسلم ڈیموکریسی کی کامیابی کی وجہ یہ ہے کہ وہ استبداد کے خلاف ایک عملی متبادل پیش کرتی ہے جو آزادی، تعددیت اور انصاف پر قائم ہے۔ اسلامی حکومت کا ایک مثالی ماڈل پیش کرنے کے بجائے مسلم ڈیموکریسی ایک ایسا نظام پیدا کرنا چاہتی ہے جس میں مختلف نظریات آپس میں مل کر رہ سکیں۔ پروفیسر مارچ نے کہا کہ میں راشد غنوشی سے زیادہ اس بات پر عمل کرنے والا کسی کو نہیں پاتا۔ وہ اپنے اعتقادات کی وجہ سے ابتک دو رمضان جیل میں گذار چکے ہیں۔ ان کا جیل میں رہنا مسلم ڈیموکریسی کے لئے ایک حقیقی امتحان ہے اور وہ یہ بھی واضح کرتا ہے کہ عالم اسلام میں ڈیموکریسی کی جڑیں پھیلانا کتنا مشکل ہے۔

پروفیسر مارچ نے کہا کہ ڈیموکریسی محض ایک نظام کا نام نہیں بلکہ وہ ایک کلچر ہے جس پر لوگوں کا ایمان ہونا ضروری ہے۔ اگر ڈیموکریسی، استبداد اور خانہ جنگی میں سے کسی ایک کو چننا ہو گا تو ایسی حالت میں مسلم ڈیموکریسی ہی بہترین حل ہے جو مسلم سوسائٹیوں میں استقرار اور تعددیت کی ضامن ہو گی۔

(ترجمہ: ظفر الاسلام خان۔ ماخذ: الجزیرہ عربی ویب سائٹ، ۲۷ مارچ ۲۰۲۵)

شذراتِ سر سید جلد اول: ایک مطالعہ

ہندو۔ مسلم مسائل و تعلقات کے تناظر میں

کلیم صفات اصلاحی
رفیق دارالمصنّفین
kaleemsefatislahi@gmail.com

ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستانیوں اور بالخصوص مسلمانوں پر جو قیامت ٹوٹی اور دہلی کی سڑکوں پر جس طرح قتل عام ہوا، ستون دار پر جس طرح سروں کے چراغ رکھے گئے، غموں کی سیاہ رات جس قدر طویل ہوئی، ہندوستان کی سرزمین نے مسلمانوں کے دور حکومت میں ظلم وستم کا اس قدر خوف ناک منظر کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کا مقصد ایک باہمت و باعزت قوم سے جینے کا حوصلہ چھین لینا تھا۔ اپنے اس مشن میں بہت حد تک اس زمانے میں برطانوی حکومت کو کامیابی بھی ملی۔ جور و جفا، مطلق العنانیت اور شر و فساد کے اس ننگے ناچ کے بعد پوری ہندوستانی قوم پژمردگی و مردنی سی کیفیت کے سایے میں چلی گئی۔

ایسے میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں میں سر سید جیسا باشعور اور حالات کا صحیح ادراک کرنے والا عالی دماغ شخص پیدا کیا جس نے ملت کے مردہ جسم میں توانائی ڈال دی۔ انہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کے فکر و عمل، تعلیم و تعلم اور تہذیب و ثقافت پر جو گہرا اثر ڈالا اور ان کے اندر ماضی سے روشنی حاصل کر کے حال کی جہالت و تاریکی کو دور کرنے کا جو ذوق و شوق پیدا کیا وہ یقیناً ملک و ملت کے تئیں ان کے مستقل غور و فکر اور جگر کاوی کا نتیجہ ہے۔ انہوں نے ہندوستانیوں، خاص طور سے مسلمانوں، کے علمی، تعلیمی، ادبی، تمدنی، سیاسی، مذہبی اور ملی حالات کا تاریخی و تجزیاتی مطالعہ کیا تھا اور اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ فکری انقلاب کے لیے بر وقت کوئی نہ کوئی قدم لیک و لکیر سے ہٹ کر اٹھانا ضروری ہے۔ اسی احساس کے تحت مسلمانوں میں وقت کے تقاضے کے مطابق عصری و جدید سائنسی علوم سے رغبت پیدا کرنے کے لیے انہوں نے انتہائی جاں گسل محنت اور تگ و دو کی اور اپنی

پیش بینی وروشن ضمیری سے ان کو مستقبل کا آئینہ دکھا کر یہ بتانے کی کوشش کی کہ اگر تعلیم وترقی یافتہ قوموں کی طرح باعزت وباوقار قوم بن کر جینا ہے تو اپنی فکر وسوچ میں وقت کے تقاضے کے مطابق تبدیلی لانا پڑے گی اور جدید نافع کو اپنی ملی زندگی کا جز بنانا پڑے گا۔

واقعات بتاتے ہیں کہ جب انہوں نے قوم وملت کو اپنے منصوبے پر گامزن کرنے کی کوشش شروع کی تو اس اقدام کے لیے انہیں اکابر علما کی جانب سے بڑی بیزاری واعراض کا سامنا کرنا پڑا لیکن اپنے عزائم کی تکمیل میں وہ جبل متین کے مثل ثابت قدم رہے۔ سرسید اپنے ہمنواؤں اور ہم خیالوں کو ساتھ لے کر اپنے منصوبے کی کشتی کھیتے رہے اور ان کا قافلہ قدم بہ قدم اپنی منزل کی جانب آگے بڑھتا رہا اور ان کی تعمیری سوچ کے مثبت نتائج بھی سامنے آتے رہے۔ کتاب "شذرات سرسید" فکری وذہنی انقلاب کے لیے سرسید کی کاوشوں کی تفصیلات فراہم کرتی ہے۔ نیز یہ کتاب عہد حاضر کے مسلمانوں کو نامساعد حالات میں بھی پورے عزم وحوصلہ کے ساتھ آگے بڑھنے کا قابل قدر جذبہ عطا کرتی ہے۔

یہ ضخیم اور لائق مطالعہ کتاب پروفیسر اشتیاق احمد ظلی کی تحریک پر ترتیب دی گئی ہے۔ اصل میں یہ سرسید کے مشہور اخبار علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں تحریر کردہ بتیس برس (۱۸۶۶-۱۸۹۸) کے شماروں سے منتخب ان کے شذرات اور مضامین کی پہلی جلد ہے جس کو دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی نے ان کے دوصد سالہ جشن ولادت کے موقع پر ان کو خراج تحسین پیش کرنے کے مقصد سے شائع کیا تھا۔ اس کی اشاعت کے سلسلہ میں اس وقت کے ناظم دارالمصنّفین اشتیاق احمد ظلیؔ لکھتے ہیں:

> سرسید کی خدمات اور ملک وملت پر ان کے بے پایاں احسانات کے ساتھ ساتھ ان سے علامہ شبلی کے گوناگوں روابط کی وجہ سے فطری طور پر ہماری خواہش تھی کہ ان کی پیدائش پر دوصدیاں مکمل ہونے کے موقع پر دارالمصنفین میں قوم کے اس محسن کو یاد کیا جائے اور ان کی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا جائے[۱]۔

علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی کے مقاصد کا ترجمان تھا۔ اس کا اجرا ۳۰ مارچ ۱۸۶۶ء کو ایسے علاقے میں عمل میں آیا جو تعلیمی اور معاشی لحاظ سے دوسری ریاستوں کے بالمقابل پسماندہ تھا۔ ضرورت تھی کہ اس علاقے کے باشندوں کے سامنے تعلیم کی اہمیت واضح،

---

[۱] پروفیسر اصغر عباس، شذرات سرسید، جلد اول—دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ ۲۰۱۷ء ص (ج)

حالات حاضرہ سے باخبر اور وقت کے تقاضوں سے انہیں ہم آہنگ کیا جائے اور ساتھ ہی اس سے وہ علاقے بھی مستفیض ہوں جن کی حالت تعلیمی و معاشی لحاظ سے ان سے بہتر ہے۔ یہ اخبار دو لسانی تھا۔ اس میں مضامین اور اداریے انگریزی اور اردو ترجموں کے ساتھ شائع کیے جاتے تھے تاکہ انگریزی حکام کے سامنے اہل اردو کے مسائل ان کی زبان میں رکھے جائیں۔

اس کی خصوصیات کے متعلق یہ بات بھی کہی جاتی ہے کہ اردو صحافت کی تاریخ میں علی گڑھ گزٹ اردو کا پہلا اخبار تھا جو ٹائپ میں چھپتا تھا۔ عالمی رجحانات سے واقفیت اور اردو زبان کو علمی، سائنسی اور تحقیقی اعتبار سے باثروت اور مالا مال بنانے کا سلسلہ پہلی بار اسی اخبار سے شروع ہوا۔ یہ اخبار ابتدا میں ہفتہ وار تھا لیکن ۲ جون ۱۸۷۷ء سے سہ روزہ ہو گیا۔ اس کے بعد سر سید ہی کے بیان کے مطابق مضامین کی عدم دستیابی اور اخراجات طباعت کی دشواری کی وجہ سے تہذیب الاخلاق کو تیسری بار بند کر کے اس رسالے کو بھی اسی اخبار میں ضم کر دیا گیا اور یہ ہفتہ وار ہو گیا(۲)۔ اس کا مخاطب ہر ہندوستانی تھا۔ یہ اس لیے ممکن تھا کہ اس زمانے میں بلا تفریق مذہب و ملت شمالی ہند میں جو بھی پڑھا لکھا ہندوستانی تھا، اردو زبان و ادب سے اچھی طرح واقف یا کم از کم اس کو کام چلانے کے برابر اردو و فارسی آتی تھی۔ سر سید نے اس اخبار سے ہندوستانی اقوام سے کیا چاہا تھا اسے اجرا کے موقع پر ۳۰ مارچ ۱۸۶۶ء کے گزٹ میں تمہیدی کلمات میں اس طرح واضح کیا تھا:

یہ بات ہر کوئی کہہ سکتا ہے کہ ہمارے زمانہ کے اکثر لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ اپنے ہم وطنوں کو فائدہ پہنچانے اور ان کو علم و ہنر اور عقل و دانش کی روشنی دکھانے کی ہم کو کیا حاجت ہے کیوں کہ اور بہت سے لوگ یہ کام کر رہے ہیں اور بے شک یہ بات سچ ہے کہ ایسے لوگوں سے جو اپنے مقدور بھر ان لوگوں کی مدد کرنے کو ہر دم موجود ہیں جو انسانوں کی بھلائی میں کوشش کر رہے ہیں، نہ اب یہ زمانہ خالی ہے اور نہ آئندہ خالی ہو گا...... لیکن ہندوستان میں بہت سی خلقت جاہل اور ناتربیت یافتہ ہے اور جو لوگ کچھ لکھے پڑھے ہیں نہ تو ان کو وہ کتابیں میسر آسکتی ہیں اور نہ ان سے کچھ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اس پر سب سے زیادہ بدنصیبی یہ ہے کہ علم کا شوق اور لکھنے پڑھنے کا ذوق نہیں رکھتے، علم کی باتوں کا ان کو مذاق ہی نہیں۔ تہذیب الاخلاق اور درستی صفات پر کچھ دھیان ہی نہیں مگر پھر بھی خدا کا شکر ہے کہ چند روز سے لوگوں کو اپنی جہالت دور کرنے اور علم و ہنر کو ترقی دینے کا

---

(۲) یہ تمام تفصیلات پروفیسر اصغر عباس نے اپنے مقدمے میں فراہم کی ہیں۔ دیکھئے مأخذ سابق ص ۱ - ۲

کچھ کچھ خیال آتا جاتا ہے اور علم کا مزہ روز بروز روز بروز لگتا جاتا ہے[۳]۔

سر سید نے ہندوستانیوں کی تعلیمی و اخلاقی صورت حال پر یہ تبصرہ اس وقت تحریر کیا تھا جب انھوں نے ڈیڑھ سو سال قبل اس کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا تھا۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ سر سید نے اپنے زمانے کے ناخواندہ افراد کے اندر علم و فضل سے دلچسپی پیدا کرنے کے لیے جو کوشش شروع کی تھی اس میں انہیں کامیابی بھی ملنی شروع ہو گئی تھی اور کچھ حد تک وہ اس سے مطمئن بھی ہو رہے تھے۔ البتہ اس زمانے کی عمومی حالت کا جو نقشہ انھوں نے کھینچا ہے اس کو سامنے رکھا جائے اور ان کے ذوق و شوق سے اگر موجودہ صورت حال سے اس کا تقابل کیا جائے تو برادران وطن سے قطع نظر مسلمانوں کی تعلیمی و اخلاقی حالت کے سلسلے میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اس میں اطمئنان بخش اصلاح و سدھار اب تک نہیں آسکا ہے۔ یہ مسئلہ اب بھی تھوڑے فرق کے ساتھ ویسے ہی موجود ہے جیسے عہد سر سید میں تھا۔ آج بھی مسلمانوں میں علمی، تعلیمی، سائنسی، ذہنی اور اخلاقی عروج کا وہ منظر نہیں دکھائی دیتا جس کا خواب سر سید نے دیکھا تھا۔ اس کے اسباب کا ادراک کر کے اس کے صحیح تدارک یا تلافی مافات کی کوشش سے انکار نہیں ہے۔ موجودہ قائدین ملت اپنی استطاعت کے مطابق اپنے حصے کے کام کی انجام دہی میں مصروف بھی ہیں تاہم اس حقیقت کے اعتراف میں کوئی مضائقہ نہیں کہ آج کے حالات بھی سر سید جیسی ہی قربانی، محنت اور مثبت طرز فکر کے متقاضی ہیں۔

یہ کتاب ۵۰۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں پہلے ۳ صفحات میں ظلی صاحب کا پیش لفظ ہے، جس میں سر سید کے علمی مقام و مرتبہ اور ملک و ملت پر ان کے ناقابل فراموش احسانات پر مجملاً گفتگو کی گئی ہے۔ اس کے بعد سر سید سے علامہ شبلی کے تعلقات اور سر سید کے دو صد سالہ جشن ولادت کے موقع پر ان کی غیر مدون تحریروں پر مشتمل ایک مجموعے کی اشاعت کے اپنے منصوبے کا ظلی صاحب نے تذکرہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ جب اس منصوبے کی تکمیل کی درخواست مشہور محقق اور مصنف پروفیسر اصغر عباس سے کی تو انہوں نے اس کو نہ صرف قبول کیا بلکہ اس کو بہ حسن و خوبی تکمیل تک پہنچایا۔

پیش لفظ کے بعد مرتب کا ۱۴ صفحات پر مشتمل پر مغز مقدمہ ہے جس میں پہلے سر سید کی سائنٹفک سوسائٹی کے مقاصد کے ترجمان اخبار ''علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' کے اجرا، اس کے

[۳] مأخذ سابق، ص ۱۵-۱۶

مقاصد، اس کی خصوصیات و امتیازات، اجرا کے وقت ہندوستان کے شمال مغربی منطقے کے حالات، شذرات اور مضامین کے موضوعات، ہندوستان کی کامل ترقی کے متعلق سرسید کے خیالات، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے خانوادہ سے سرسید کے خاندان سے گہرے تعلقات، عصری علوم کی طرف مسلمانوں کو مائل کرنے کے لیے سرسید کی کوششیں، ہندوستانی زراعت میں نئی جان ڈالنے اور تجارت کو فروغ دینے کے لیے ان کی مختلف تدبیریں، اردو کتابوں پر تبصرے کا آغاز اسی اخبار سے ہونے اور سرسید کے ایک ایسی تہذیب کے متمنی ہونے کا ذکر ہے جس کا سنگم مغرب اور ہندوستانی تہذیب کے ملاپ پر مبنی ہو۔ سرسید کے علم مسکوکات (یعنی سکوں کے علم) کے متعلق لکھا گیا ہے کہ ان کو اس علم پر بڑی دسترس تھی، اس سے تاریخ کی کھوئی ہوئی کڑیوں کو جوڑنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ اس بات کا انکشاف بھی کیا گیا ہے کہ پوری اردو شاعری اور نثر میں سرسید سے قبل عروج وزوال اندلس کا کہیں کوئی حوالہ نہیں ملتا۔ اندلس کی بربادی کا سید یحیٰ قرطبی نے مرثیہ لکھا تھا، سرسید نے پہلی بار اس کا غیر مقفی اردو ترجمہ کیا۔ یہ بات بھی کہی گئی ہے کہ اس اخبار نے ہندوستانیوں کے اجتماعی طرز احساس کو اپنی صحافت کا حوالہ بنا دیا تھا۔ اس میں انیسویں صدی کے نصف آخر کا ہندوستان سانس لیتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ مرتب نے یہ بات بھی لکھی ہے کہ سرسید کے فکر و عمل کے معروضی تجزیے کے لیے گزٹ کا مفصل جائزہ لینا ضروری ہے۔ ان کے نزدیک اس اخبار کی حیثیت اردو صحافت کی تاریخ میں ستارۂ صبح کی ہے۔ مقدمے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں سرسید کے مضامین اور شذرات کو مرتب کرنے کا ارادہ سب سے پہلے حالی نے کیا تھا لیکن بہ سبب عوارض وہ یہ کام نہ کر سکے تو مولوی عبد الحق سے کرانا چاہا مگر وہ بھی نہ کر سکے۔ مرتب کے بیان کے مطابق اس مجموعے میں شامل عربی و فارسی عبارتوں پر نظر ثانی اور قرآن مجید اور احادیث کے حوالوں کی تخریج و تحقیق ظلی صاحب نے کی ہے۔ کہیں کہیں مرتب کی جانب سے توضیحی حواشی بھی موجود ہیں لیکن بعض ضروری مقامات پر حواشی نہ لکھے جانے سے تشنگی کا احساس بھی ہوتا ہے۔

پرفیسر اصغر عباس مرحوم کو تصنیف و تالیف کا عمدہ ذوق تھا۔ زبان میں سادگی و چاشنی اور اسلوب بیان میں روانی تھی۔ سرسید، علی گڑھ تحریک اور عہد حاضر میں سرسید کے کارناموں کی معنویت کو سمجھنے اور سمجھانے میں انہوں نے زندگی کھپائی تھی۔ ان کو تحقیق و تدقیق اور ترتیب و تدوین

کے فن اور اس کی باریکیوں سے بھی گہری واقفیت تھی اور وہ موضوعات کو سلیقہ و ترتیب سے پیش کرنے کا ہنر جانتے تھے۔ شذرات سرسید کی ترتیب و تدوین میں انھوں نے اپنے اسی تجربے سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور پورے مواد کو تاریخی ترتیب سے پیش کیا ہے تاکہ قاری کو سرسید کے ذہنی ارتقا کو سمجھنے میں مدد ملے۔ شذرات کے موضوعات کے متعلق فاضل مرتب لکھتے ہیں:

> سرسید کے تمہیدی کلمات سے لے کر ان کے آخری مضمون "اردو اور ناگری" تک عنوانات کی ایک دنیا آباد ہے جس میں اعلی عصری تعلیم سے لے کر تہذیب اخلاق، سیاست، مذہب، ادب، جانوروں پر رحم، اثری آثار، علم مسکوکات، تاریخ، لسانیات، اقتصادیات، زراعت اور تہذیب نسواں اور طرز فکر میں اجتہاد کے علاوہ بہت سے موضوعات کو جگہ ملی ہے[۴]۔

اس مجموعے میں شذرات اور مضامین کی جو فہرست دی گئی ہے ان کی کل تعداد ۱۶۹ ہے۔ زیادہ تر شذرات ایک یا دو صفحوں اور کچھ مضامین تین چار اور کچھ اس سے بھی زیادہ صفحات میں ہیں۔ یہ گویا ملت بیمار کے لیے اس کی ذہنی سطح کو پیش نظر رکھ کر خوراک کے طور پر لکھے گئے ہیں تاکہ احساس مظلومیت سے اوپر اٹھ کر وہ تازہ دم اور ذہنی بیماری و پریشانی سے جانبر ہو سکے۔ اس میں اشخاص واعلام کے کارناموں، اہم کتابوں، اداروں، اردو اور عربی زبان، اخباروں، عورتوں اور کالجوں وغیرہ کے مسائل پر سرسید کی فکر انگیز تحریریں ہیں جن سے عہد حاضر کے مسلمانوں کو بھی رہنمائی ملتی ہے۔ ذیل میں اس کے عناوین مخصوص موضوعات کے خانوں میں منقسم کر کے اس مقصد سے نقل کیے جاتے ہیں کہ شذرات کے تنوع، اس کی رنگارنگی کا اندازہ ہو اور یہ معلوم ہو سکے کہ آج کے حالات میں کون سا عنوان لائق مطالعہ اور کس فکر سے اس وقت استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

ہندوستانیوں اور تاریخ ہند سے متعلق شذرات: سرسید کو ہندوستانی تاریخ اور ہندوستانیوں سے محبت تھی۔ انگریز جو ہندوستان پر حکمراں تھے ہندوستانیوں کو اپنا غلام سمجھ کر ان سے توہین آمیز برتاؤ کرتے تھے۔ سرسید نے بعض انگریزوں کے اس برتاؤ کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ انہوں نے ان کے اندر باہم محبت و ہمدردی پیدا کرنا چاہا۔ ملک کی ترقی کے راز سے واقف کرانے کی کوشش کی۔ ہندوؤں کی ترقی پر حوصلہ افزا باتیں کہیں۔ کس پیشہ کو انہیں اختیار کرنا چاہئے اس کی جانب توجہ دلائی۔ درج ذیل مضامین ان کی اس دلچسپی کے نتائج ہیں:

---

[۴] مأخذ سابق، ص ۴

اے ہندوستانیوں ہوش میں آؤ، میسور کے راجہ کا مقدمہ، جواب انگلش مین کے ایک آرٹیکل کا جس میں انہوں نے ہندوستانیوں کو بے عزت ٹھہرایا، اشرفی عہد عالم گیری، ہندوؤں کو بھی انگلستان کے سفر کی جانب توجہ دینی چاہیئے، ہندوستانیوں کو باہم محبت وہمدردی پیدا کرنا چاہیئے، ایک دلچسپ نظیر واسطے اہل ہند کے، ملک کی ترقی اسی حالت میں ہے جب کہ وہ اپنی جملہ ضروریات کی اصلاح کرلے، ہندوؤں میں ترقی وتہذیب، ہندوستان کی پرانی عمارتیں، عام تعلیم ہندوستان کی، ہندوستانیوں کے لیے عبرت، اہل ہند، گورنمنٹ ہندوستان کی پالیسی، انگلستان کی لبرل اور کنزرویٹیو گورنمنٹ اور ہندوستان، ہمارے ہندو بھائیوں کی ہمت روز افزوں پر آفریں، ہندو بھائیوں کی ترقی،، ہندوستانی طالبعلم کو کیا پیشہ اختیا کرنا چاہیئے۔

کتابوں اور اخبارات سے متعلق شذرات: سر سید سے قبل کسی رسالے یا میگزین میں کتابوں پر تبصرے کم ہی دکھائے دیتے ہیں۔ ان کے زمانے میں جو اہم کتابیں منظر عام پر آتی تھیں ان کا تعارف اور تبصرہ بھی وہ اپنے اخبار میں کرتے تھے۔ ان تبصروں کی خاص بات یہ تھی کہ ان میں مصنف کے نقطۂ نظر کی وضاحت اور کتاب کی اہمیت کا تعین کیا جاتا تھا۔ کتاب کے سلسلے میں نئے تصورات کو ابھارنے اور ان کو عملی جامہ پہنانے کے لیے تجاویز بھی پیش کی جاتی تھی۔ گویا صرف کتاب اور اس کے موضوعات سے قارئین کو متعارف کرانا ہی مقصود نہیں ہوتا تھا بلکہ اس سے متعدد مفید مقاصد بھی حاصل کیے جاتے تھے۔ درج ذیل کتابوں پر تبصرے اس اخبار میں موجود ہیں:

دیباچہ تاریخ فیروز شاہی، عورتوں کا اخبار، مجالس النساء، کوہ نور اور پنجابی اخبار، مرقع تہذیب، اودھ اخبار پر نالش، اودھ اخبار، تصاویر اخبار میں، مرثیہ مصائب اندلس، مسدس بطور مرثیہ، اخبار وکیل، ہندوستان امرتسر، سفرنامہ جناب محمد سمیع اللہ خان، ہماری لیف، اخبار سول وملٹری گزٹ اور ایڈیٹر اخبار عروۃ الوثقی، پٹنہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، ریویو رسالہ مضمون ''مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم'' پر، العلوم الجدیدۃ والاسلام، دیوان شیخ محمد ابراہیم، امیر اللغات اردو، مجموعہ اخلاق، تہذیب الاخلاق، دعوت اسلام، المقدمۃ فی فلسفۃ اللغہ العربیۃ۔

اشخاص سے متعلق شذرات: سر سید کے تعلقات اس وقت کے اہل علم اور انگریز دانشوروں سے تھے۔ اپنے شذرات میں انہوں نے ملک وبیرون ملک کی جن معروف ومشہور شخصیات کا ذکر کیا ہے ان میں مسلم وغیر مسلم علما وفضلا، جج صاحبان اور حکمراں طبقہ شامل ہے۔ ان کی سرگرمیوں کا ذکر

سرسید اس گزٹ میں اس مقصد سے کرتے تھے کہ عوام میں بیداری آئے اور ان کے اندر کام کرنے اور آگے بڑھنے کا جذبہ ابھرے۔ اس مجموعے میں شامل شذرات میں سرسید نے علامہ شبلی کا ذکر سب سے زیادہ ۳ مرتبہ کیا ہے۔ شخصیات کا ذکر درج ذیل عناوین سے ملاحظہ فرمائیں:

آنریبل نواب شرف الامرا بہادر، گارساں دتاسی (۲ مرتبہ)، مسٹر فارسٹر صاحب، سفیر ٹرکی [۵] اور مدرسۃ العلوم علی گڑھ، ہمارے قدیم دوست منشی واجد علی خاں صاحب اور ہم، سید احمد خان اور مدرسۃ العلوم، نواب مرزا خاں داغ سلمہ اللہ تعالیٰ، مسٹر البرٹ بل، یادگار شیخ محمد ابراہیم ذوق و محمد اسد اللہ خاں غالب، مولوی محمد حسین صاحب آزاد (۲ مرتبہ)، آنریبل مسٹر جسٹس سید محمود، بابو ابھی ناش چندر سب جج علی گڑھ، بدرالدین طیب جی، دی آنریبل پنڈت اجودھیا ناتھ صاحب اور مسلمان، سرسید احمد اور مسٹر امیر علی مگر کہوں گا سرسید احمد اور مولوی امیر علی، جج چیف کورٹ پنجاب [۶] سید احمد کی لیف (لائف) اور کام، تاریخ فیاضی حضور عالی نظام نسبت مدرسۃ العلوم علی گڑھ، مولوی شبلی نعمانی (۳ مرتبہ)، ریٹ آنریبل دادابھائی نوروجی ایم پی، مولانا الطاف حسین حالی، مولانا حافظ نذیر احمد صاحب، مرزا غلام احمد قادیانی اور وہ فرقہ جس کو وہ نیچری کہتے ہیں۔

خالص اسلام اور مسلمانوں سے متعلق شذرات: اسلام اور مسلمانوں کے عروج وزوال کی تاریخ پر سرسید کی بڑی گہری نظر تھی۔ اسی لیے ان کے زمانے میں جب اسلام اور مسلمانوں کے مسائل و معاملات پر کوئی بات کرنا ہوتی تو ان پر کھل کر اظہار خیال کرتے تھے۔ بالخصوص مسلمانوں کی علمی و تعلیمی ترقی، طرز حکومت اور مسلکی و تہذیبی امور پر فکر انگیز خیالات کا اظہار ان شذرات میں کیا ہے۔ درج ذیل مضامین کا تعلق ان کے اسی قسم کے مسائل و موضوعات سے ہے:

بیوہ عورتوں کا نکاح ثانی، مسلمانوں کی قسمت، اسلام از قسطنطنیہ تا بہ کلکتہ، مسلمان اور سرکاری نوکری، مسلمان اور ہندوستان کی قومیں، لندن اور عید مسلمان، مسلمانوں کی قومی ترقی، درخواست جملہ مسلمانان ہر شہر و دیار سے واسطے امداد تعمیر مسجد مدرسۃ العلوم مسلمانان، مدرسۃ العلوم مسلمانان واقع علی گڑھ کی خوش قسمتی، میرٹھ میں عید الاضحیٰ، مسلمان اور ہندوستان کی قومیں،

---

[۵] سید احمد خلوصی آفندی

[۶] آنریبل بابو پرتول چندر

قومی والنٹیئروں کی ضرورت، وہابی اہل حدیث یا متبع حدیث، ایشیائی اور اسلامی طرز حکومت، تمام مسلمانوں کو بلکہ اسلام کو مبارک باد۔

تعلیم سے متعلق شذرات و مضامین: سر سید ماہر تعلیم بھی تھے۔ تعلیم سے متعلق ان کے نظریات واضح تھے۔ وہ جدید تقاضوں کے مطابق تعلیم کے حصول کو ہندوستانیوں کے لیے ضروری سمجھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے ملت کے سامنے قومی تعلیمی پالیسی کا ایک قابل اتباع نمونہ پیش کیا اور علی گڑھ گزٹ میں ان موضوعات پر توجہ دی۔ ہندوستان میں تعلیمی پالیسی سے متعلق مضامین و شذرات درج ذیل ہیں:

شمالی لندن کا کالجیٹ اسکول لڑکیوں کے واسطے، خواب ہندوستان کی تعلیم پر، نظم کی تعلیم، مسلمانوں کی عام تعلیم، عام تعلیم ہندوستان کی، ہم کو کیا سیکھنا چاہئے، مصر میں مدرسے اور علوم کی تعلیم، تعلیم اولاد، تعلیم انگلستان میں، مسلمانوں کی تعلیمی حالت، فضیلت یا معلم الطلباء، مصر اور یورپ کی تعلیم ہندوستان کے لیے ایک نظیر، ہندو صاحبوں کی قومی تعلیم پر توجہ۔

علمی و تعلیمی اداروں اور تنظیموں اور کانفرنسوں سے متعلق مضامین: سر سید نے اپنے عہد کے علمی و تعلیمی اداروں پر اظہار خیال کیا ہے اور ان کے متعلق بھی مواد فراہم کیا ہے۔ اس قسم کے مضامین اور شذرات کے مطالعے سے اس عہد کے عصری و مذہبی علوم کے حامل علمی و تعلیمی اداروں کی صورت حال سامنے آتی ہے۔ مدرسۃ العلوم علی گڑھ پر نسبتاً زیادہ شذرات ہیں۔ تنظیموں اور ملک بھر میں منعقدہ جلسوں کا ذکر بھی کیا ہے۔ ان کا مطالعہ آج بھی ملت کے لیے مفید اور خود کو اس میدان میں آگے بڑھانے کے لیے مہمیز کا کام کر سکتا ہے۔ درج ذیل شذرات و مضامین سر سید کی تعلیمی پالیسی اور اس کے دائرۂ کار کو واضح کرتے ہیں:

بنارس انسٹی ٹیوٹ، سفیر ٹرکی اور مدرسۃ العلوم علی گڑھ، دہلی کالج، مدرسۃ العلوم مسلمانان، سید احمد خان اور مدرسۃ العلوم، جلسۂ زراعت، اسلامی مدرسہ دیوبند، وینچسٹر کالج، الٰہ آباد محمڈن کلب، شہادت ایجوکیشن میں، مدرسۃ العلوم مسلمانان، آگرہ کالج، حیدرآباد محبوب کلب، مصر میں مدرسے اور علوم کی تعلیم، مدرسۃ العلوم علی گڑھ اور اس کے حامی و مددگار، اوریئنٹل کانگریس وائنا، مدرسۃ العلوم مسلمانان واقع علی گڑھ کی خوش قسمتی، بھارت ورشی نیشنل ایسوسی ایشن لائل لائبریری کی سالانہ رپورٹ، مدرسہ طبیہ مجیدیہ دہلی، مدرسہ طبیہ حکیم عبدالمجید خاں

صاحب، محمڈن اینگلو عربک اسکول پٹنہ، مصر اور یورپ کی تعلیم اور ہندوستان کے لیے ایک نظیر، ہماری یونیورسٹیاں اور امتحانات کے اسٹینڈرڈ، محمڈن اسکول علی گڑھ اور آئندہ سکریٹری کے تقرر کا فیصلہ، لندن، ہم اور نیشنل کانگریس، مدرسۃ العلوم کا بجٹ اور سید احمد خاں کا عجب طرز سے اپنے دوستوں کا شکریہ ادا کرنا، دائرۃ المعارف، حیدرآباد دکن، انجمن حمایت اسلام لاہور، ہندو صاحبوں کی قومی تعلیم پر توجہ۔

اردو اور عربی زبان وادب سے متعلق شذرات: سر سید اردو، عربی، فارسی وغیرہ میں عبور رکھتے تھے۔ ان کے علاوہ ان کو دوسری زبانوں انگریزی اور عبرانی سے بھی بہ خوبی واقفیت تھی۔ علی گڑھ گزٹ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں شائع ہوتا تھا۔ اردو اور عربی زبان و ادب کے مسائل وامور پر بھی بعض شذرات اور مضامین ملتے ہیں جیسے اردو زبان، ہمارا علم ادب، دہلی کی اردو زبان، اردو مثنوی ترانۂ شوق، کیا اردو زبان کے اشعار سے ہر حالت میں اردو زبان کے لیے استناد ہو سکتا ہے؟ عربی زبان، انگریزی خواں طالب علم متعلق اردو ناگری۔

متفرق موضوعات سے متعلق مضامین وشذرات: ان خصوصی موضوعات کے علاوہ درج ذیل شذرات متفرق موضوعات سے متعلق ہیں جو پڑھنے کے لائق ہیں، ان میں فکر و فلسفہ، حکمت، زراعت، سکے اور ملک کی ترقی کی باتیں ہیں، یورپ میں فن تصنیف کا حال ہے، جیسے:

تمہید، سچائی، التماس، آرٹیکل، لاوارث اور محتاج بچوں کی حفاظت، مسافران انگلستان، دختر کشی کے انسداد کے قاعدے، قوم یورپ کو فن تصنیف کے باب میں کیسا اہتمام ہے، خام خیالی، اخبار نویسوں کو کس بات کا لحاظ چاہئے، آتش بازی، ملک کی ترقی اسی حالت میں ہے جب کہ وہ اپنی جملہ ضروریات کی اصلاح کر لے، زبردستی کا قحط، تدبیر ترقی نظم، دل لگی کی بات، مژدۂ مبارک، رحم کی کمیٹی، زمانہ کی ترقی کے آثار، سول سروس، مرثیہ مصائب اندلس، مسدس بطور مرثیہ، زمانہ حال کے سکے، انگلش کائن یعنی انگلستان کے سکے، زمانہ کا تبدل، صنعت و حرفت، جلسہ زراعت بجنور کا، قومی اخلاق اور مذہب، وراثت، کشتی حضرت نوح کی، ہماری لیف، لکچر حب الوطنی، اشعار، عجیب سوال و جواب، رمز لطیف، مینار یا مأذنہ واقع کول، ہم پر ہمارے دوست کی تعریض، دوست اورآپس کا برتاؤ، ہمارے حسب حال، رسید کتب، بدنام کن نکونامی چند، ڈپوٹیشن بھوپال، سکہ، علمی پوشاک میں علمی جلوس، شکریہ ہمدردی وتسلی احباب، زندگی اور موت،

ہم بھی کبھی اسی رنگ میں تھے، من اطاع السلطان فقد اطاع الرحمن۔

ان شذرات و مضامین میں عہد سر سید کے علمی، تعلیمی، ثقافتی واقعات و حوادث کی وہ جزئیات موجود ہیں جو عام محقق اور ناقد کی نظر میں نہیں آپاتیں۔ ان کے مطالعے سے محسوس ہوتا ہے کہ ملت اسلامیہ ہند اس زمانے میں جس طرح کے مسائل سے دوچار تھی دو سو سال کے بعد آج بھی کم و بیش اسی طرح کے مسائل کا اسے سامنا ہے۔ اس پس منظر میں سر سید کے افکار کی معنویت بہ آسانی سمجھ میں آتی ہے۔ انہوں نے اپنے دور میں جس طرح رہنمائی اور فکری قیادت کی اور مسائل سے نبرد آزمائی کا جو طریقہ بتایا وہ آج اسوہ بنانے کے قابل ہے۔ مثال کے طور پر آج کے زمانہ میں جھوٹ کا جس طرح دبدبہ اور بول بالا ہے، سچائی جس طرح پس پشت ڈالی جارہی ہے اور صدق کے منہ پر تالے لگائے جارہے ہیں اور لوگوں کی اکثریت سچ کو اچھا جانتی ہے لیکن کہتی نہیں، بالکل یہی صورت حال ان کے زمانہ میں بھی تھی۔ ۲۰ اپریل ۱۸۶۶ء کے گزٹ میں لکھتے ہیں:

> لوگ سچ کو مذاق میں ٹالتے ہیں، اچھا کہتے ہیں پر بولتے نہیں۔ اچھا جانتے ہیں پر کہتے نہیں۔ سچ کو پوچھتے ہیں پر سنتے نہیں، ہزاروں ہیں جو تلون مزاجی سے خوش ہیں، سچ پر قائم نہیں رہتے۔ اپنے خیالات کو، اپنے افعال کو سچ کا پابند نہیں رکھتے۔ سچ کے ڈھونڈھنے میں کچھ مشقت نہیں، سچ میں کچھ دھوکہ نہیں جو آدمی اسے چھوڑے اور جھوٹ کو پکڑے مگر ایک جبلی عادت کہ آدمی کو جھوٹ بولنے کا مزہ آتا ہے[۷]۔

سر سید کی صحافتی جرأت: جس زمانہ میں گزٹ جاری ہوا تھا اس وقت کے حالات صحافت کے لیے بھی بڑے نازک اور پر خطر تھے۔ دہلی اور لکھنؤ کے اردو محاوروں کی ایک دوسرے پر برتری یا ہندوؤں میں نکاحِ بیوگاں کے مسئلے پر زبان کھولنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ انگریز بہادر کا ہر قول حرف آخر سمجھا جاتا تھا اور اردو اخبارات میں ان کے کسی فیصلہ کی تردید کی جرأت کسی کو نہ ہوتی تھی۔ تقریباً بیسویں صدی کے آخر تک یہی صورت حال تھی۔ ایسے میں پروفیسر اصغر عباس کے بقول سر سید کی اس جرأت کو سلام کہ گزٹ کے سرنامہ پر یہ عبارت چھاپی جاتی تھی "آزادی چھاپہ کی ہے، ایک بڑا فرض گورنمنٹ کا اور ایک اصلی اور جبلی حق رعیت کا[۸]"۔ سر سید کا یہ جملہ حکومت

---

[۷] مأخذ سابق ص ۱۸

[۸] مأخذ سابق ص ۳

وقت کی برملا تنقید پر مشتمل ہے۔

ایک جگہ مسٹر کیمپسن کی اس تجویز کی کھل کر مخالفت کی کہ ایک یونیورسٹی دیسی زبان کی ان اضلاع میں کھولی جائے جس میں انگریزی صرف بہ طور ایک زبان کے سکھائی جائے۔ ۲۰/مارچ ۱۸۶۸ء کے گزٹ میں سر سید لکھتے ہیں: "اس بیان میں مسٹر کیمپسن صاحب نے صریح غلطی کی ہے۔ چنانچہ اس وجہ سے ایسوسی ایشن کی تجویز کے جابجا ایسے مخالف پیدا ہوگئے ہیں جو اور صورت میں ہر گز نہ ہوتے[9]"۔

یہ اور اس طرح کی اور بھی مثالیں شذرات میں موجود ہیں جن سے سر سید کے اعلی اصول صحافت اور حکومت برطانیہ کے سامنے جرأت اظہار کا علم ہوتا ہے۔ موجودہ حالات میں بیشتر صحافیوں کی غلامانہ ذہنیت اظہر من الشمس ہے۔ ضرورت سر سید کے اصول صحافت کو اپنانے کی ہے۔

وراثت کے متعلق سر سید کی رائے: ہندوستان میں اسلام کے قانون وراثت کے متعلق بعض اخبارات نے غلط فہمی پھیلانے کی کوشش کی اور آج بھی اس کے اصولوں اور قوانین پر بڑی بے باکی اور جرأت سے تنقید کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ سر سید کے زمانے میں اودھ اخبار میں قانون وراثت اسلام کے عنوان سے ایک انگریزی مضمون کا ترجمہ چھپا تھا جس میں یہ خیال ظاہر کیا گیا تھا کہ وراثت سے متعلق قرآن مجید کے احکام قابل ترمیم و تبدیل ہیں۔ سر سید نے مضمون نگار کی رائے سے اختلاف کیا اور لکھا کہ قرآن مجید کے کسی بھی اصول یا قانون کو قابل ترمیم سمجھنا غلطی ہے۔ وہ قیامت تک کے لیے غیر مبدل ہے۔ علما کی رائے محدود اور اس میں غلطی کا امکان ہوتا ہے لیکن قرآن میں نہیں۔ ۱۲/دسمبر ۱۸۸۲ء کے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں وہ لکھتے ہیں:

> ہم اس مضمون کے ماحصل سے متفق ہیں مگر اس بات سے اختلاف کرتے ہیں کہ قرآن مجید کے احکام قابل ترمیم یا تبدیل ہیں۔ قرآن مجید بطور قاعدہ کلیہ کے ایسے عمدہ اصول پر نازل ہوا ہے کہ کسی زمانہ میں بھی اس کی ترمیم کی حاجت نہیں ہے۔ ہاں بلاشبہ علمانے جو اپنے اجتہاد یا رائے سے جو مسئلے قائم کیے وہ محدود ہیں اور شاید ان میں غلطی بھی ہے اور وہی قابل ترمیم ہیں مگر ان مسائل کے قابل ترمیم ہونے سے قرآن مجید کو قابل ترمیم سمجھنا غلطی ہے[10]۔...... قرآن

---

[9] مأخذ سابق ص ۴۸

[10] مأخذ سابق ص ۲۷۰، ۲۷۱

مجید میں جائیداد کی تقسیم کا مسئلہ ایسا صاف و صریح اور عمدہ ہے کہ اس سے زیادہ عمدہ نہیں ہو سکتا اور کسی زمانے میں قابل ترمیم نہیں ہے۔

اردو اور دیوناگری کے مسئلے پر سرسید کی رائے: ۱۸۶۷ء میں شمال مغربی صوبہ کے بعض پڑھے لکھے ہندو راجہ جے کشن داس، بھارتیندو بابو ہریش چندر رسا، راجہ شیو پرشاد وغیرہ نے، جن کی اپنی قوم کی خواتین کی بول چال اور تحریر کی زبان اردو تھی، راجہ جے کشن داس سرسید کے احبابِ خاص اور ان کے قائم کردہ ادارہ سائنٹفک سوسائٹی کے اعلیٰ عہدہ دار بھی تھے، اردو کے بجائے دیوناگری کو سرکاری محکموں، دفتروں اور عدالت کی زبان بنانے کی تحریک کی حمایت کی تھی۔ ان لوگوں نے اس مسئلے میں سرسید کا ساتھ نہیں دیا اور دیوناگری کو عدالتی زبان بنانے پر مصر رہے۔ بعض لوگوں نے اردو کے زمانۂ رواج کے متعلق بھی غلط بیانی پھیلانے کی بھی کوشش کی۔ اس طرح دوستی اور تعلق کے باوجود سرسید اردو زبان کی مخالفت کرنے والے اپنے ہندو احباب کی غلط فہمیوں کی تردید کرتے رہے۔ اس کے اسباب کا تذکرہ کرتے ہوئے ۱۹ مارچ ۱۸۹۸ء کے گزٹ میں لکھتے ہیں:

> گو مسلمانوں کے عہد میں اور مدت تک انگریزوں کے عہد میں فارسی زبان عدالتوں میں جاری رہی، مگر جن حرفوں میں اردو لکھی جاتی ہے ان حرفوں کو جاری ہوئے تو صدہا برس گزر گئے اور ہندو اور مسلمان دونوں انہی حرفوں سے نہایت مانوس ہو گئے۔ یہ خیال کرنا کہ صرف ۱۸۳۲ء میں اردو زبان کا رواج ہوا صحیح نہیں ہے کیوں کہ اس سے بہت پیشتر سے اردو زبان کو شاعری سے ترقی ہو گئی تھی اور اسی زمانہ میں اہل ملک کو اردو زبان سے موانست ہو گئی تھی۔ وہ موانست دفعتاً قطع نہیں ہو سکتی۔ اس کو قطع کر دینا ہزاروں لاکھوں آدمیوں کی دل شکنی کا باعث ضرور ہو گا۔ ہندوؤں میں بھی خصوصاً کایستھوں میں ہندی زبان اور ناگری کا رواج نہیں رہا ہے اور ان کی تمام پرائیوٹ خط و کتابت اردو زبان اور اردو حرفوں میں ہے۔ پس کوئی وجہ کافی اس بات کی نہیں ہے کہ اردو زبان اور اردو حروف موقوف کیے جائیں اور بجائے اس کے ہندی زبان اور ناگری حروف جاری کیے جائیں۔[۱۱]

اپنے زمانے کے دہلی کی اردو کے متعلق سرسید کا خیال: ایک طرف تو سرسید اردو زبان کے حقوق کے لیے لڑ رہے تھے اور دوسری طرف اس زبان کا دلی کی گلیوں میں جو حال تھا اور اپنوں

---

[۱۱] ماخذ سابق ص ۵۰۲-۵۰۳

کی طرف سے اس کے حق میں جو لاپروائی ہو رہی تھی اس کا شکوہ بھی کر رہے تھے۔ لکھنؤ کے اخبار ’’آزاد‘‘ نے مخزن المحاورات[۱۲] کے نام سے ایک کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے دلی اور لکھنؤ کی زبان کو بول چال اور صفائی میں ترقی اور آگے بڑھ جانے والی زبانوں میں شمار کیا۔ سر سید اپنی رائے کے اظہار میں آج کے ملی قائدین کی طرح مصلحت کوشی کے بہت قائل نہیں تھے۔ انہیں جو صحیح لگتا تھا بے تکلف اور بلارورعایت کے کہہ دیتے تھے۔ مخزن المحاورات کے ریویو پر رائے زنی کرتے ہوئے اپنے زمانے کے دہلی کی اردو کے متعلق ۶/اکتوبر ۱۸۸۶ء کے گزٹ میں لکھا:

> لکھنؤ کے اخبار آزاد نے کتاب مخزن المحاورات پر جو حال میں چھپی ہے ایک مختصر مگر نہایت دلچسپ ریویو لکھا ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے ان مقاموں میں جہاں کی بول چال ترقی اور صفائی میں سبقت لے گئی ہے، دہلی اور لکھنؤ کو شمار کیا ہے مگر انھوں نے یہ نہیں لکھا ہے کہ کون سی دہلی؟ گزشتہ دہلی یا حال کی دہلی۔ کیونکہ حال کی دہلی محض ایک گنوار وشہر ہوگیا ہے۔ وہاں اب بگڑی ہوئی اردو بولی جاتی ہے۔ اس زمانہ کے دہلی کے نوجوانوں کی زبان کسی طرح سند کے لائق نہیں ہے۔ جن لوگوں سے دلی دلی تھی وہی نہیں رہے اب کیسی دلی اور کیسی دلی کی زبان[۱۳]۔

مسلمان اور ہندوستان کی قومیں: سر سید نے تعلیمی اور علمی دلچسپیوں اور قومی و ملی خدمات کی انجام دہی میں ہندوستان میں آباد دوسری قوموں بالخصوص ہندو برادران وطن سے مسلمانوں کا موازنہ اس مضمون میں کیا ہے اور ان کو زمینی حقیقت سے آشنا کیا ہے۔ دونوں قوموں کی ترجیحات اور طرز فکر میں اس زمانہ میں بھی کس قدر دوری اور بُعد تھا، اس مضمون کے مطالعے سے اس کا اندازہ ہوتا ہے۔ تقریباً ڈیڑھ سو برس پہلے کی مسلمانوں کی جو صورت حال سر سید نے تحریر کی ہے اس میں اور موجودہ صورت حال میں خوش گوار وپائیدار تبدیلی کا منظر دیکھنے کی چشم فلک آج بھی منتظر ہے۔ انہوں نے اس دعوے کو چند دلائل سے مستحکم بھی کیا ہے اور دونوں قوموں کی ترجیحات پیش کی ہیں۔ سر سید نے اس ضمن میں جو دلائل دیے ہیں وہ لائق مطالعہ ہیں۔

---

[۱۲] یہ اردو زبان کی ایک لغت ہے۔ اس کے مؤلف منشی چرنجی لال تھے۔ دیکھئے ڈاکٹر مسعو ہاشمی، اردو لغت نویسی کا تنقیدی جائزہ، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی ۱۹۹۲ء، ص ۶۶

[۱۳] ماخذ سابق، ص ۳۴۰

سر سید کے مطابق آگرہ کالج ہندو راجہ کے عطیہ سے چلتا تھا۔ قریب المرگ ہو گیا تھا، ہندوؤں نے کوشش کر کے اس کے لیے روپیہ جمع کیا اور اس کو ایسا متحرک کیا کہ شمالی مغربی اضلاع کے سربر آوردہ کالجوں میں اس کا شمار ہونے لگا۔ اپنی بے پناہ قربانیوں اور جد وجہد کی وجہ سے ان کو استحقاق پہنچتا ہے کہ اس کا نام تبدیل کر کے ہندو کالج یا آریہ کالج[۱۴] کے نام سے موسوم کریں۔ ہندو شروع شروع میں ولایت جانے اور انگریزوں سے کسی قسم کے اختلاط کو اپنی ذات اور مذہب کے بالکل خلاف سمجھتے تھے اور مسلمان تعلیم کے لیے ولایت کا سفر کرتے تھے۔ اس تدبیر سے محسوس ہوتا تھا کہ وہ تعلیم میں ان کے ہم سر ہو جائیں گے لیکن ہندو بھائیوں نے ان کو ٹھوکر مار کر انہیں پیچھے ہٹا دیا اور اس وقت ہندو ولایت کے کالجوں میں مسلمانوں سے پانچ حصہ زیادہ تعلیم پا رہے ہیں اور برابر آگے ہی بڑھ رہے ہیں۔ قدرت کے قاعدے کی رو سے ضرور ہے کہ مسلمان ان کے سامنے سر جھکائیں اور ان کی کفش برداری کریں۔ دیانند اینگلو ویدک کالج لاہور جن مذہبی اصولوں کے رائج کرنے کے قصد سے قائم کیا گیا تھا ہندو اس کے مخالف تھے مگر اس خیال سے کہ اس کا قیام ہندوؤں کے لیے باعث فخر ہو گا اس کی امداد کرتے ہیں۔ لائق لائق پروفیسر بلا تنخواہ پڑھاتے ہیں۔ کسی مسلمان نے بھی ایسا کیا ہے۔ منشی کالی پرشاد نے اپنی قوم کی ترقی کے لیے الہ آباد میں پاٹ شالہ قائم کیا اور کئی لاکھ روپیہ کی اپنی جائیداد اس کے لیے وقف کر دی۔ خود علی گڑھ کے بابو طوطا رام کی لائبریری کے متعلق ہر شخص تسلیم کرتا ہے کہ وہ بہت مفید نہیں لیکن ہندو صاحبوں نے اپنی بے نظیر امداد سے اس کے لیے بہترین عمارت تعمیر کرا دی۔

ہندوؤں کی ملکی، قومی و مذہبی بیداری کا جیتا جاگتا ثبوت ان کی موجودہ تنظیم آر ایس ایس ہے جو اگرچہ نظریاتی اور فکری لحاظ سے تمام ہندوؤں کی آواز نہیں ہے لیکن اس کو دعویٰ ہے کہ وہی ان کے حقوق کی اصلی پاسدار ہے۔ اس نے پورے ہندوستان میں اپنے ہم خیالوں کی مدد سے پیر پسار لیے ہیں اور اپنی سخت محنت اور عمل پیہم سے ملک کے کونے کونے میں اپنی شاخیں قائم کی ہیں جو دن رات اپنے عزائم کی تکمیل میں لگی ہوئی ہیں۔ اس کے چاہنے والے دامے درمے سخنے اس کے لیے

---

[۱۴] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوؤں نے آگرہ کالج کا نام بدلنے کی تحریک چلائی اور برطانوی حکومت کے سامنے تجویز رکھی تھی جس کی سر سید بھی ان کی قربانیوں اور اس کے احیائے نو کی کوششوں کے سبب حمایت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ہر طرح سے تیار رہتے ہیں۔ اس نے اپنی قوم کی ذہن سازی کچھ اس طرح پوری چوکسی اور پورے نظم وضبط کے ساتھ کی اور سو برس سے اپنی خاص فکر کی تبلیغ واشاعت کی خاطر اس طرح محنت کی ہے کہ اس فکر کے حاملین ومتبعین اس کی بقاوترقی کے لیے اپنی جائیدادیں وقف کرتے ہیں۔ سرکاری وظیفہ یاب ملازمین اس کی بلا معاوضہ خدمت کرتے ہیں۔ ہندوؤں نے آگے بڑھنے کے لیے اس کے اصولوں کو اپنی زندگی میں اختیار کیا ہے۔ اس کے لیے ذاتی پسند وناپسند کو خارج کیا ہے۔ تنظیم کی بقاوتحفظ کی خاطر باہمی دشمنی وعناد کو پس پشت ڈالنا ان کے خمیر میں شامل ہے۔ ان کی ترقی کے پیچھے یہ اور اس طرح کے اسباب ہیں، جن کو انہوں نے ایک مدت سے اختیار کیا ہے۔ مسلمانوں میں ایسی کوئی تنظیم آج بھی نہیں ہے جو فکری لحاظ سے اس قدر مضبوط ومستحکم ہو اور اس کے نزدیک اپنے کاز کے لیے وہ بیداری نظر آئے جو مذکورہ بالا تنظیم کے یہاں نظر آتی ہے۔ سر سید نے اس طرح کے واقعات کو گزٹ میں تحریر کر کے اصلاً مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنا چاہا تھا لیکن قوم نے ان کی اس آواز پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی اور انہیں ۴/ اکتوبر ۱۸۸۷ء کے گزٹ میں مجبوراً یہ لکھنا پڑا:

> جس قدر تجربہ ہوا اور جس قدر غور کیا جاتا ہے سب کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اب ہندوستان کے مسلمانوں کو ہندوستان کی اور قوموں سے ہم سری کرنا محالات سے معلوم ہوتا ہے۔ گو یہ نتیجہ قیاسی ہے مگر زمانہ کے موجودہ واقعات اور مسلمانوں کے تعصبات اور ان کو جھوٹا گھمنڈ اور بے جا تفاخر، نااتفاقی اور باہمی اس نتیجے پر یقین دلاتی ہیں........ ہمارے ملک کے ہندو بھائی ہم سے اس قدر آگے بڑھ گئے ہیں کہ اگر مسلمان دوڑ کر بھی ان کو پکڑنا چاہیں تو نہیں پکڑ سکتے۔ مسلمانوں کی طینت وطبیعت ہی اس زمانہ میں ایسی ہوگئی ہے کہ ان کی طرف سے بالکل مایوسی ہوگئی ہے۔[۱۵]

سر سید کے اس اقتباس میں گو اس زمانہ کے مسلمانوں کا حال ہے لیکن کیا یہ حالات عہد حاضر کے مسلمانوں کی سچی تصویر کشی نہیں کرتے اور کیا اتنا طویل عرصہ گذرنے کے باوجود مسلمان آج بھی ہندو بھائیوں سے رفتار ترقی میں بہت پیچھے نہیں ہیں۔ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کہ اس موجودہ پسماندگی کی حالت کی ذمہ داری صرف مسلمانوں پر ہی نہیں ہے۔ اس کے پیچھے مسلمانوں کو نظر انداز کرنے اور ان کو حاشیہ پر لانے کی حکومتی پالیسیاں بھی ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے اپنے حالات پر غور کر کے اپنی حالت تبدیل کرنے کی اگر وہ کوشش کی ہوتی جو عام طور سے

---

[۱۵] ماخذ سابق، ص ۳۵۳

محروم قومیں کرتی ہیں تو نقشہ یقیناً کچھ اور ہوتا۔ مسلمان آج بھی اگر مقصد کے تئیں سنجیدہ ہو جائیں، ملک وملت اور مذہبی تعلیم و ہدایت کو مقدم رکھیں، ذاتی عناد اور باہمی اختلاف و مخاصمت پر ملی مفاد کو ترجیح دینے کی عادت ڈال لیں تو اللہ کی ودیعت کردہ لیاقت کے بل پر وہ آسمانوں میں کمندیں ڈال سکتے ہیں اور سر سید کے یاس انگیز اور دیرینہ خواب کی خوب صورت تعبیر ڈھونڈ سکتے ہیں اور رفتار زمانہ کی ڈور اپنے ہاتھ میں پکڑ سکتے ہیں۔

مسلمانوں کو اس وقت کیا کرنا چاہئے: انگریزوں نے مسلم حکمرانوں سے ملک چھینا تھا۔ مسلمان اس کے سب سے زیادہ اہل تھے کہ وہ اقتدار واپس لینے کی کوشش کرتے اور اس میں دو رائے نہیں کہ انہوں نے سب کچھ لٹنے کے بعد بھی آزادی کے لیے جس انداز سے ایثار و قربانی پیش کی اس سے زیادہ کی توقع ایک مفتوح و مغلوب قوم سے نہیں کی جاسکتی۔ ملک و قوم کے لیے بے پناہ قربانیوں کے باوجود حالات ایسے بن گئے کہ ان کے اپنے وجود پر بن آئی۔ سر سید نے یہ زمانہ بہت قریب سے دیکھا اور ان زخموں کو سہا تھا۔ ایسے حالات میں حکمراں قوم سے مصالحت کرکے علمی، تعلیمی، تہذیبی اور مذہبی لحاظ سے خود کو باقی رکھنے اور آگے بڑھنے کی جو تدبیر کی وہ یقیناً مسلمانوں کے لیے بروقت صحیح علاج تھا۔ ان کے مطابق اس وقت مسلمانوں کو سر آکلینڈ[۱۶] کی نصیحت پر عمل مناسب ہوگا کہ حالات بدلنے پر آدمی کو اپنے عادات واطوار میں تبدیلی لانی چاہئے۔ سر سید نے سر آکلینڈ کے جو ناصحانہ الفاظ اردو میں نقل کیے ہیں، اس سے موجودہ حالات میں مسلمانوں کو بہت کچھ روشنی حاصل ہوتی ہے۔ ۲۸ جون ۱۸۹۲ء کے گزٹ میں لکھتے ہیں:

> اس وقت ہماری قوم اگر سر آکلینڈ کالون کی نصیحت پر عمل کرے تو بے شک اس کو کامیابی ہو سکتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ مثل ہے کہ جب آدمی بدل جاتے ہیں تو ان کے اوضاع واطوار بھی ساتھ ہی بدل جاتے ہیں۔ خاندان تیموریہ کی تلوار اگر اب بالائے طاق رکھی جاوے تو وہ مستعدی، استقلال و دلیری اور برداشت جو اس تلوار کے جوہر تھے اب بھی کام آسکتے ہیں جو کچھ مسلمانوں کو قائم رکھنا چاہئے وہ ان کے آباواجداد کا تند اور متعصبانہ جوش نہیں ہے بلکہ وہ بڑے اوصاف ہیں جنہوں نے اس تند اور متعصبانہ جوش کو فرمانروائی کے قابل بنایا تھا۔ وہ اوصاف

---

[۱۶] لارڈ ڈفرن اور سر آکلینڈ کالون کے متعلق یہ بات کہی جاتی ہے کہ کانگریس سے الگ ہونے کی راہ انہوں نے ہی سر سید کو سجھائی تھی۔

کامیابی حاصل کرنے کے اب دوسرے مقاصد حاصل کرنے میں صرف کرنے چاہئیں............ ہمارے باپ دادا نے شخصیہ حکومت برتی ہو یا جمہوری، پھر انہوں نے جمہوری اصول کو توڑا ہو یا سرے سے اختیار ہی نہ کیا ہو، وہ گذر گئے اور جو کچھ ان کو اچھا یا برا کرنا تھا وہ کر گئے، ہم کو اپنا زمانہ بھگتنا ہے۔ پس ہم کو وہ تدبیر کرنی چاہئے جو اس زمانہ کے حسب حال ہو اور اس کے سبب ہماری قوم موقر وخوش حال رہے۔ ہم کو اب اگلی حکومت کے خواب دیکھنے نہیں چاہئیں بلکہ اس بات کی فکر کرنی چاہئے کہ ہم کو ایک معزز اور ممتاز ووفادار رعایائے ملکہ معظمہ کوئن وکٹوریہ امپرس آف انڈیا ہو کر کسی طرح اپنی ترقی کی کوشش کرنی چاہئے۔ یہی ہمارا فرض از روئے مذہب کے ہے اور یہی راہ ہماری ترقی وخوش حالی کی ہے۔[۱۷]

سر آکلینڈ کالون کے مشورے کا پس منظر یہ ہے کہ انھوں نے اپنی سیاسی قوت اور برطانوی اقتدار کی حفاظت کے لئے یہ نصیحتیں کی ہوں گی تاکہ برطانوی حکومت ہندوستان پر باقی رہے۔ سر سید نے اس نصیحت کو اس لیے مسلمانوں کے حق میں بہتر سمجھا کہ ان کے سامنے ان کے وجود کا مسئلہ درپیش تھا۔ آج مسلمانوں کے سامنے حصول آزادی کا مسئلہ نہیں ہے۔ مسلمان ایک آزاد جمہوریت میں رہ رہے ہیں جس کو حاصل کرنے کے لیے انہوں نے بے نظیر قربانی دی ہے۔ اس ملک پر مسلمانوں کا اتنا ہی حق ہے جتنا دوسری قوموں کا ہے۔ اگرچہ اکثریت اپنی طاقت کے نشہ میں چور ہے اور مسلمانوں کو اپنی شرطوں پر رہنے پر مجبور کر رہی ہے تاہم ان حالات میں بھی حسن تدبیر اور ملک وقانون سے عہد وفاداری استوار کر کے باعزت زندگی گذاری جاسکتی ہے۔ وقت اور سر سید کی حکمت عملی کا تقاضہ یہی ہے۔

یہاں اس بات کا تذکرہ ضروری ہے کہ اس کتاب کی اشاعت پر ابھی دو سال بھی نہ گذرے تھے کہ مجلس ترقی ادب، لاہور نے اسے شائع کر دیا اور وہاں بڑی ڈھٹائی سے یہ لکھ کر فروخت کی جا رہی ہے کہ پاکستان میں یہ کتاب پہلی بار شائع ہو رہی ہے۔ اس کے لئے دارالمصنفین سے اجازت بھی نہیں لی گئی ہے۔ کتاب کے تعارف میں مرتب کے مقدمے کا ذکر ہے لیکن پیش لفظ اور دارالمصنفین کا ذکر نہیں ہے۔ مرتب کا نام بھی غلط یعنی "علی اصغر عباس" لکھا ہے[۱۸]۔

---

[۱۷] ماخذ سابق، ص ۴۵۲

[۱۸] ایکسپریس نیوز، بک شلف صفحہ پر، اتوار ۴/ اکتوبر ۲۰۲۰ء

نوادرِ سہیل

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی
رفیق اعزازی، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ

علامہ شبلی نعمانی (۱۸۵۷-۱۹۱۴ء) کی عظمت وجامعیت میں ان کی مایۂ ناز سخنوری بھی شامل ہے۔ انہوں نے تینوں زبانوں اردو، فارسی اور عربی میں دادِ سخن دی ہے۔ یہ اوصاف اور شعری کمالات ان کے تلامذہ کی ادبی زندگی میں بھی بہت نمایاں ہیں۔ علامہ حمید الدین فراہی کی عربی وفارسی شاعری، مولانا سید سلیمان ندوی کی اردو وعربی شاعری، مولانا عبد السلام ندوی کی اردو اور مولوی مسعود علی محوی (سیشن جج عدالت عالیہ حیدرآباد دکن) کی فارسی شاعری، مولانا ظفر علی خاں کی اردو شاعری اور علامہ اقبال احمد خاں سہیل (۱۸۸۴-۱۹۵۵ء) کی اردو و فارسی شاعری بالخصوص قومی شاعری ان کے جامع الکمالات استاد یعنی علامہ شبلی کی سخنوری کا پرتو ہیں۔

علامہ شبلی کی شعری روایات کو جس صاحب کمال شاگرد نے سب سے زیادہ ترقی دی اور اسے اوج کمال تک پہنچایا، وہ شاعر بے نظیر علامہ اقبال احمد خاں سہیل کی ذات گرامی ہے۔ انہوں نے اپنے استاذ کی امانت شعر وادب کی نہ صرف حفاظت وصیانت کی بلکہ اس کو ارتقاء کی نئی منزلوں، رفعتوں اور نئے زاویوں سے آشنا کیا۔ علامہ شبلی کے بعد اعظم گڑھ کا ادبی افق جن کے دم سے مطلع انوار بنا بلاشائبہ مبالغہ وہ اقبال احمد خاں سہیل کی شخصیت اور شاعری ہے۔ وہ اردو وفارسی کے بلند پایہ اور نہایت قادر الکلام شاعر تھے۔ اور محض شاعر ہی نہ تھے بلکہ مایۂ ناز ادیب وانشا پرداز اور نقاد بھی تھے، لیکن ان کا اصل تمغۂ امتیاز ان کی شاعری وسخنوری ہی ہے، جس میں وہ اپنے عہد میں یکتا وعدیم النظیر تھے۔ اقبال احمد خاں سہیل ضلع اعظم گڑھ کے ایک گاؤں بڑھریا میں ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مولانا محمد شفیع بانی مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اور مولانا محمد یعقوب سے حاصل کی۔ بعد ازاں علامہ شبلی اور مولانا حمید الدین فراہی (۱۸۶۴ء-۱۹۳۰ء) کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کئے۔ پھر کچھ دنوں تک بنارس کے مشہور کوین انگریزی اسکول میں تعلیم حاصل کی۔ جس میں سرسید نے اپنے

صاحبزادے سید محمود (۱۸۵۰۔۱۹۰۳ء) کو پڑھایا تھا۔ اس کے بعد سہیل صاحب نے ایم اے او کالج علی گڑھ کا رخ کیا۔ وہاں سے انہوں نے ایم اے، ایل ایل بی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ یہاں ان کے احباب اور ہم سبق دوستوں میں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں (۱۸۹۷۔۱۹۶۹ء) سابق صدر جمہوریہ ہند، نامور ادیب و مزاح نگار پروفیسر رشید احمد صدیقی سابق صدر شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور سرزمین اعظم گڑھ کے نہایت نامور غزل گو مرزا احسان احمد (۱۸۹۶۔۱۹۷۱ء) جیسی اہم اور مایۂ ناز شخصیتیں تھیں۔ تحصیل علم کے بعد 1918ء وہ اعظم گڑھ واپس آئے اور وکالت شروع کی، جس میں بڑی شہرت و ناموری حاصل کی اور ان کا شمار ماہر قانون اور ضلع کے چوٹی کے وکلا میں ہوا۔ یہی ان کی زندگی کا غلط فیصلہ تھا جسے علم و ادب کا نہایت روشن اور نیر تاباں ہونا تھا وہ محض ایک وکیل ہو کر رہ گیا۔ وکالت کی تضحیک مقصود نہیں ہے۔ بس مقابلتاً اظہار تاسف ہے۔

بعض اہل علم کا خیال ہے کہ وہ اگر وکالت کا مشغلہ نہ اختیار کرتے تو ہندوستان کے پہلے اقبال نہ سہی دوسرے اقبال ضرور ہوتے۔ افسوس ۷ نومبر ۱۹۵۵ء کو قانون اور شعر و ادب کا یہ نیر تاباں ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔ ان کی تدفین اعظم گڑھ شہر کے قبرستان غازی دلیل خاں میں ہوئی ہے۔

دبستان شبلی کے اس بلبل رنگیں نوا کی رنگیں نوائی کے ذکر سے پہلے اختصار سے اس کی نثری کاوشوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ شاعروں کو عموماً نثر نگاری میں وہ کمال حاصل نہیں ہوتا جو شاعری میں ہوتا ہے لیکن دبستان شبلی کے شعرا بالخصوص علامہ اقبال احمد سہیل ان منفرد شعرا میں تھے جنہیں نثر پر بھی کمال دسترس حاصل تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ شعر و ادب کے جس موضوع پر جب چاہتے قلم برداشتہ لکھتے اور ایسی عمدہ، سلیس، شگفتہ اور رواں دواں نثر لکھتے تھے کہ پڑھنے والا اس کے سحر میں گرفتار ہو جاتا تھا۔ زمانہ گذر گیا مگر آج بھی ان کی نثر ویسی ہی تر و تازہ اور سحر آفریں ہے۔ گو ان کا نثری سرمایہ محدود و مختصر ہے، لیکن جو کچھ ہے وہ بہت وقیع اور منفرد اوصاف و خصوصیات کا حامل ہے۔ اس سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا ہے، لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ اس سے کماحقہ اعتنا نہیں کیا گیا۔

مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے استاذ علامہ شبلی کی سوانح عمری کا کام اولاً مولانا عبد السلام ندوی کے سپرد کیا تھا مگر وہ اس کا حق ادا نہیں کر سکے تو اس کی ذمے داری اقبال احمد خاں سہیل کے کاندھوں پر ڈالی، چنانچہ انہوں نے اس کا آغاز کیا جو بالاقساط ماہنامہ الاصلاح سرائے میر میں شائع ہوتا رہا، لیکن وہ اپنی متنوع مصروفیات کے سبب اسے پایۂ تکمیل کو نہ پہنچا سکے، البتہ جو کچھ لکھا اس

سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ نثر نگاری اور ادب وانشا پر پوری دسترس رکھتے تھے بلکہ وہ سوانح نگاری کے ہنر سے بھی واقف تھے۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے حیات شبلی میں اس سے بھرپور استفادہ کیا۔ فضل الرحمٰن اصلاحی اسکالر دارالمصنّفین نے اسے مرتب کرکے "سیرت شبلی" کے نام سے یکجا شائع کرادیا ہے۔

علامہ مرحوم کی نثری کاوشوں کا مجموعہ "افکار سہیل" عرصہ ہوا شبلی نیشنل کالج اعظم گڑھ سے اس کے مشہور اور نہایت فعّال پرنسپل مرحوم شوکت سلطان (۱۹۱۳ء۔۱۹۸۶) اور ممتاز ادیب و نقاد میجر علی حماد عباسی کی کوششوں سے شائع ہوا تھا۔ اس سے پہلے محمد حسن ڈگری کالج جونپور نے اپنی سالانہ میگزین کا ایک نمبر نکال کر اور سہیل مرحوم کے منتشر کلام کو یکجا کر کے انہیں خراج عقیدت پیش کیا تھا۔ اس کے بعد افتخار اعظمی (م:۴/اپریل ۱۹۹۴ء) نے مطالعۂ سہیل سے پوری دلچسپی لی اور ان کے کلام کے کئی مجموعے مرتب کرکے شائع کرائے۔ آخر میں ان کے نواسے محمد عارف رفیع صاحب نے "کلیات سہیل" شائع کیا، جس کا طبع جدید مکتبہ دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی سے دستیاب ہے اور اب اس کو فاروس میڈیا نے ناگری رسم الخط میں بھی شائع کر دیا گیا ہے۔ جسے دارالمصنّفین اور فاروس میڈیا دہلی سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

علامہ اقبال احمد سہیل کے مجموعہ کلام موج کوثر، تابش سہیل، ارمغان حرم اور افکار سہیل وغیرہ شاعری اور نثر نگاری کے لحاظ سے بلند رتبہ تو ہیں ہی ان کے عناوین بھی کانوں میں رس گھولتے ہیں۔ البتہ نثری و تنقیدی مضامین کے مجموعہ "افکار سہیل" پر پہلی اشاعت کے بعد پھر کبھی توجہ نہیں دی گئی اور نہ اس میں کسی قسم کا اضافہ ہوا، حالانکہ اس کے بعد کئی نادر تحریریں دستیاب ہوئیں۔ ایک نادر تحریر ڈاکٹر شباب الدین صاحب نے اور بعض کمیاب تحریریں اس ناچیز راقم نے شائع کی ہیں۔ تلاش و جستجو سے اور بھی تحریریں رسائل و جرائد میں مل جائیں گی۔ "افکار سہیل" ایک زمانے سے دستیاب بھی نہیں ہے۔ ضروری اضافوں کے ساتھ اس کے طبع ثانی کی ضرورت اور اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ میرا خیال ہے جس طرح دارالمصنّفین نے "کلیات سہیل" شائع کیا ہے، اسی طرح "افکار سہیل" کو بھی شائع کرکے اہل علم تک پہنچایا جاسکتا ہے۔

بہرکیف گذشتہ دنوں علی گڑھ منتھلی اور علی گڑھ میگزین کی ورق گردانی کے دوران علامہ اقبال احمد سہیل کی ایک نادر فارسی غزل، ایک فارسی قصیدہ، ایک قطعہ تاریخ جو انہوں نے سرسید کے

پوتے سر راس مسعود (۱۸۸۹ء۔۱۹۳۷ء) کی شادی کے موقع پر کہے تھے۔علاوہ ازیں ایک اور نادر نظم "سحر سہیل" کے عنوان سے ملی ہے۔ان کی یہ تخلیقات "کلیات سہیل" میں شامل نہیں ہیں۔ محفوظ کرنے کے خیال سے وہ قارئین معارف کے نذر کی جاتی ہیں۔

قصیدۂ فارسی: یہ قصیدہ سر سید احمد خان کے پوتے اور سید محمود (۱۸۵۰ء-۱۹۰۳ء) کے صاحبزادے سر راس مسعود (۱۸۸۹ء۔۱۹۳۷ء) کی شادی کے موقع پر کہا گیا تھا۔ان کی شادی ۱۶/ نومبر ۱۹۱۴ء کو بڑی دھوم دھام سے ہوئی تھی۔ہارون خاں شروانی نے لکھا ہے کہ:

> ۱۶/ نومبر ۱۹۱۴ء کو مسعود کی شادی صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کی صاحبزادی زہرہ بیگم کے ساتھ ہوئی۔صاحب زادہ صاحب علی گڑھ کے ممتاز ترین شہریوں میں سے تھے اور اپنی فطری قابلیت کی وجہ سے وہ بعد میں چل کر وزیر ہند کی مشاورتی مجلس کے رکن اور مسلم یونیورسٹی کے امیر مقرر ہوئے۔اس تقریب کی تفصیلات آج اٹھاون برس بعد بھی راقم الحروف کے ذہن پر نقش کالحجر ہے۔ اس میں علی گڑھ کے ہندو مسلم عمائد، انگریز عہدے دار ، کالج کے ٹرسٹی، سر سید غفرلہ کے ہم نشیں، سید محمود کے مدح خواں اور خود مسعود کے دوست، ہندوستان کے دور دراز مقامات سے آکر شریک ہوئے۔[1]

اقبال احمد سہیل نے یہ فارسی قصیدہ اسی تقریب کے لئے کہا تھا اور غالباً سنایا بھی تھا اور جو دسمبر ۱۹۱۴ء کے علی گڑھ منتھلی میں چھپا ہے۔اس تقریب کے دو روز بعد علامہ سہیل کے استاد علامہ شبلی نے ۱۸/ نومبر ۱۹۱۴ء کو وفات پائی تو وہ مہینوں غمزدہ اور مراثی و قطعات کہہ کر اپنا غم غلط کرتے رہے۔ علامہ شبلی سے متعلق ان کی تمام تخلیقات کلیات سہیل کے حصہ نوائے شیراز میں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔اسے حسن اتفاق ہی کہیں گے کہ سید محمود کی شادی میں علامہ شبلی نے اردو قصیدہ لکھا تھا جس کا ذکر سر سید نے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں کیا ہے اور وہ کلیات شبلی اردو میں بھی شامل ہے۔اس کا ابتدائیہ یہ ہے:

پھر ہوا باد بہاری کا جو عالم میں عمل — چھا لیا سبزہ نوخیز نے سب دشت وجبل
ناز سے سوئے چمن جاتی ہے پھر باد بہار — جھومتے آتے ہیں پھر صحن چمن میں بادل
سمت قبلہ سے جو اٹھتی ہیں گھٹائیں ہر بار — کہتی ہیں توبہ زاہد سے کہ اب کی تو سنبھل

---

[1] ہارون خاں شروانی، نذر عابد، ص ۱۴

نوعروسان چمن کے ہیں نرالے انداز کہ صبا گود میں لیتی ہے تو جاتے ہیں مچل

اس قصیدہ تہنیت شادی کا اختتامیہ اور بھی پرزور ہے:

مدح مقصود نہیں جوش محبت ہے یہ میں نہیں وہ کہ لکھوں مدحت ارباب دول
مجھ کو خود حسن طبیعت پہ ہے اپنے وہ غرور کہ لکھوں مدح تو اپنا ہی لکھوں علم و عمل
میں بھی ہوں عنصری وقت جو محمود ہے تو میں بھی ہوں ناز سلف تو ہے اگر فخر اول[2]

علامہ اقبال سہیل مرحوم کا قصیدہ درج ذیل ہے:

خوشا نیشان سرائے ہند و خرم سروریحانش کہ رضوان آرزو دارد تماشائے بہارانش
نسیمش عطر می بیزد شمیمش فرحت انگیزد گلشن صد حلقہ آویز د بگوش عندلیبانش
ہوایش جان فزا باشد فضایش دلربا باشد ثنایش رابجا باشد کہ گویم باغ رضوانش
شقیقش عارض خوباں عقیقش چوں لب جاناں بہار گلشن رضواں فدائے سرو ریحانش
تلاش طور در رفعت نہالش حور در قامت جمالش ہور در طلعت زہے عزوخہے شانش
بحارش روکش کوثر بہارش از ارم خوشتر خیارش سدرہ راہم سرچہ جائے سبب ورمانش
عرارش مست چون میکش چنارش سبز در آتش بہارش چوں نگارے خوش جنوں افزاست ریعانش
نہالش خوش عیاں دلکش درون لعل وبرون آتش چناں آراست مینووش چمن پیرائے امکانش
دریں بستان سرا دانی چمن زاریست لاثانی کہ شد فرمسلمانی فزوں از رفعت شانش
بہارش ہر کہ می داند بہشت معینش خواند ز طوبے داد بستاند قد سرو خرامانش
زہے خاک علی گڑھ پائگاہ علم و ارکانش کہ باشد دانش آموز جہاں طفل دبستانش
بہ رفعت چرخ اخضر شد بہ طلعت مہر انور شد نکو بود و نکوتر شد کنون رنگ خیابانش
خوشا ایں جشن دلکش فرخا عیش فراوانش کہ اعیان جہاں چون خیل ومسعود است سلطانش
زہے آں خط سبز و حبذا چشم فسوں خوانش مگر دامے نہادہ ازپے صید غزالانش
جمال روئے وابر و رشک ماہ و مہر تابانش بہار خط سبزش فخر خلد وسنبلستانش
بشر صورت گر طینت ملک سیرت فلک رفعت سزد کائینہ داری می کند خورشید رخشانش
جمال شاہد سرمد نہالے گلشن سید کہ مسلم دم نیارد زوبہ حصر لطف واحسانش

---

(۲) کلیات شبلی ص:۲۷۔۴۷

ملک از خرمی شادان فلک درخوشدلی رقصاں طیور گلشن رضوان بہ شادی تہنیت خوانش
الٰہی شادماں باشد بہ گیتی کافراں باشد نگاہت پاسبان باشد زجور چرخ گردانش
ز بحر فیض سید گشتہ جاری چشمہ کالج بلے ارزد اگر گویم درے ہستی زعمانش
نوا سنج ندیمت گشتہ ام باشد کہ بپذیری کہ کالج گلشنے ہست و سہیل از عندلیبانش (۳)

قطعہ تاریخ: سر سید راس مسعود کی تقریب شادی کے موقع پر اقبال سہیل مرحوم نے ایک قطعہ تاریخ بھی کہا ہے جو درج بالا قصیدے کے ساتھ ہی علی گڑھ منتھلی میں چھپا ہے، جس سے سنہ ۱۹۱۴ء بر آمد ہوتا ہے۔ اس میں بڑی خوبی کے ساتھ بیگم سر راس مسعود کا نام "زہرہ" بھی باندھا ہے۔

بحمد للہ کہ اینک کتخدا شد گل باغ سیادت راس مسعود
گزیں نوبادہ گلزار سید ہمایوں شمع ایوان گاہ محمود
چو جستم مصرع سالے چناں خوش کہ باشد رشک زلف گوہر آمود
ز خورشید ایں ندا آمد کہ یارب قران مشتری با زہرہ مسعود

۱۹۱۴ء (۴)

سحر سہیل: یہ نظم علی گڑھ میگزین جولائی تا اکتوبر ۱۹۲۱ میں "سحر سہیل" کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔ اس کے مدیر علامہ اقبال احمد سہیل کے ہم سبق پروفیسر رشید احمد صدیقی استاد شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی تھے۔ انہوں نے ادارتی نوٹ میں لکھا ہے کہ:

> حسن اتفاق سے ذیل کی نظم ایک دوست عزیز کی وساطت سے مل گئی۔ اسے مولانا نے مولوی عبدالغنی صاحب انصاری بی اے (علیگ) کے خط کے جواب میں تحریر فرمایا تھا۔ فرماتے ہیں: "مدت کے بعد تمہارے دست خاص کا لکھا ہوا خط دیکھ کر قلب کو عجیب لذت حاصل ہوئی اور تحریر جواب کے وقت بے اختیار زبان قلم پر چند اشعار آ گئے۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ اشعار تقریباً تمام وکمال اب تک دماغ میں محفوظ تھے جو تمہاری تفریح طبع کے لئے ذیل میں لکھتا ہوں۔

---

(۳) علی گڑھ منتھلی، ماہ دسمبر ۱۹۱۴ء

(۴) علی گڑھ منتھلی، ماہ دسمبر ۱۹۱۴ء

یہ فارسی نظم بھی کلیاتِ سہیل کے حصہ نوائے شیراز میں شامل نہیں ہے، اس لئے نقل کی جاتی ہے:

مطلع اول

نسیم صبح شمیمے ز کوئے یار آورد پے نوازش جاں نافۂ تتار آورد
زہے خجستہ نسیمے کہ در ریاض امید نوید خرمی فصل نو بہار آورد
غریب را ز ریاض وطن گلے بخشید بہ بیکساں خبر یار غم گسار آورد
کجاست قاصد فرخندہ تا سرش گردم کہ نامۂ تو بہ صبجور بے قرار آورد
رسید گرم عنان و خنک نگاہم کرد نہاں ببرد دل و نامہ آشکار آورد
ہمیشہ باد ز عطر مراد تازہ مشام خجستہ پیک کہ مکتوب مشکبار آورد
ز چشم زخم کواکب وجودش ایمن باد کہ آب چیں ز پے چشم اشکبار آورد
کلاہ گوشۂ قدرش بہ فرقداں بر ساد کہ دستما یۂ صد عز و افتخار آورد
سپرد نامۂ رنگیں بدست مردہ دلاں تو گوئی چادر گل بر سر مزار آورد
سزد کہ خردہ جانش بہائے مزد دہم کہ جان نو بہ تن ایں امیدوار آورد
زمن عریضۂ شوقے بدست جاناں داد بہ من صحیفۂ از یار با وقار آورد
زمن شکایت ہجراں بہ یا رعرضہ نمود و ازد حکایت لطفے بہ خاکسار آورد
سرشک خامۂ دل ریش من بیار بہ برد بہ من رشاشۂ آں کلک نکتہ بار آورد
ز دل گرفتہ دعائے بہ دل نواز بگفت ز دوستدار بعلامے بدوستدار آورد
از ایں غریب کتابے بہ آنجناب بہ برد و ازاں حبیب جوابے بہ ایں نزار آورد
ز ذرہ نذر درودے بہ آفتاب رساند بہ بندہ خلعت لطفے ز شہریار آورد
ز عندلیب فغانے بہ ہمصفیراں برد بہ ایں غریب پیامے ازاں دیار آورد
زتشنہ العطشے نذر آب حیواں کرد بہ کشت سوختہ جوئے زرود بار آورد
ز گدیہ گریہ غنی عرض احتیاج کرد بہ دشت تشنہ نسیمے زمرغزار آورد

مطلع ثانی

رسید نامہ و جانے بہ جسم زار آورد   خوشا متاع گران کز پئے نثار آورد
بلند اختری آں لفافہ را نازم   کہ نامۂ تو چو محبوب در کنار آورد
ز ہے سواد نقطہائے نامۂ مشکیں   کہ نور مردمک چشم انتظار آورد
چہ حرز بازوئے جانہا کہ بندگان ترا   نویدامن ز بیداد روزگار آورد
غبار غم زنہاں خانۂ خواطر رفت   برات خرمی جان بے قرار آورد
دل فسردہ نشاط کہن ز سر بگرفت   چہ ساحر یست کہ مکتوب تو بہ کار آورد
ز ہے کمند سطورش کہ در دل عشاق   خیال گیسوئے مشکیں دل شکار آورد
خہے سواد مداد و بیاض اوراقش   کشش ارمغاں پئے دلہائے داغدار آورد
چہ خوش پیام امیدے کہ از دیار حبیب   بشارتے بہ غریبان ایں دیار آورد
زبس نکات بلند و معانی روشن   تو گوئی سلک گہر ہائے شاہوار آورد
چہ گویم ایں کہ فیوض ورود نامۂ تو   چہ نخلہائے تمنا بہ برگ و بار آورد
چہ نقشہائے بدیع از سرفسوں انگیخت   چہ ما یہ سحر طرازی بروئے کار آورد

مطلع ثالث

طراز خامۂ جادو طراز یار آورد   نگار کلک گہر پاش آں نگار آورد
از آفتاب شعاعے بہ سطح خاک انداخت   و از آنجناب خطابے بہ خاکسار آورد
بہ طور سوختہ برق جمال یار فگند   بہ رندمست مئے ناب خوشگوار آورد
بہ بلبلاں ورقے از صحیفۂ گل داد   بہ قمریاں خبر از سرد جو ئبار آورد
پیام یار بہ جاں دادۂ محبت خواند   مئے صبوح بہ منت کش خمار آورد
نبید وصل بہ لب تشنگان غربت داد   نوید عفو بہ رند سیاہ کار آورد
خراش زخم دروں را بدست ناخن داد   شکست آبلہ را نو کہائے خار آورد
بہ تشنہ ماء معینے ز حوض کوثر داد   بہ قطرہ سیل روانے ز آبشار آورد
بہ جاں بلب نفسے از لب مسیح دمید   بہ خستہ مرہم ریش دل فگار آورد
مریض تپ زدہ را نسخۂ شفا بخشید   حزین دل شدہ را حکم اصطبار آورد

به بیدلاں رقمے زاں حبیب دلجو خواند به مخلصاں خبرے زاں و فا شعار آورد
چراغ طور سر گور سامری افروخت رحیق خلد به رندان باده خوار آورد
ثنائے نامه تواں گفت اگر صفات عصا لب کلیم توانست در شمار آورد
ز جوش ناله چو مرغ اسیر معذورست سہیل اگر به لب ایں نغمه چو ہزار آورد(۵)

غزل: علی گڑھ منتھلی ہی کے نومبر دسمبر ۱۹۱۶ء (ص:۱۵۰) کے شمارہ میں ان کی ایک فارسی غزل شائع ہوئی ہے جو ان کے کلیات میں شامل نہیں ہے۔ وہ غزل درج ذیل ہے:

مردم از درد و زکس طالب درماں نشدم آفریں باد که شرمندهٔ احساں نشدم
ارنی گفت بیک جلوه غش افتاد کلیم من و یزداں که ترا دیدم وحیراں نشدم
بغلط بازی چشم تو که در بزم وصال رفتم ازخویش و حریف صف مژگاں نشدم
باختم در سر آں زلف متاع دل و دیں کفر کردم و از کرده پشیماں نشدم
فرض عشق ست بلے حوصله افزائی حسن بغلط کشته آں چشم فسوں خواں نشدم
نقد الفت سربازار نه شاید آورد خون دل کردم و از دیده نم افشاں نشدم
گہر افشاندم و چوں موج تپیدم اقبالؔ سخن انباشتم و صاحب دیواں نشدم

ان نوادرات سہیل سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ علامہ سہیل کی فارسی شاعری ان کے دور طالب علمی ہی میں کس درجہ پختہ تر ہوگئی تھی اور یہی سبب تھا کہ انہوں نے جب علی گڑھ کی ایک تقریب میں بلبل ہند سروجنی نائیڈو (۱۸۸۹-۱۹۴۹ء) کے استقبال میں فارسی قصیدہ پیش کیا تو وہ اس سے اس قدر متاثر ہوئیں کہ انہیں آخر عمر تک وہ ذہن نشین رہا۔ آخر عمر میں جب وہ یوپی کی گورنر ہوئیں اور دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ تشریف لائیں اور انہیں علامہ اقبال سہیل کی موجودگی کا علم ہوا تو وہ ان سے بڑی گرم جوشی سے ملیں اور وہ فارسی قصیدہ ایک بار پھر علامہ سہیل سے پڑھوا کر سنا اور داد دی۔ کمال تو یہ ہے کہ دور طالب علمی میں کہا گیا قصیدہ خود اقبال سہیل مرحوم کو اس وقت تک ازبر تھا:

افسوس تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی

---

(۵) علی گڑھ میگزین، ماہ جولائی تا اکتوبر ۱۹۲۱ء، جلد ۱۸ نمبر ۹ تا ۱۲، ص ۵۳-۵۵

حکیم ضیاء الدین رامپوریؒ

محمد زبیر سہیل۔ بہاول نگر
zubairbinsohail5@gmail.com

حکیم ضیاء الدین رامپوری ۲۷ رمضان المبارک ۱۲۴۲ھ بمطابق ۲۵/اپریل ۱۸۲۷ء کو قصبہ رامپور منیہاران ضلع سہارنپور میں پیدا ہوئے[۱]۔ آپ کے والد ماجد کا نام غلام محی الدین تھا جو علاقہ کی باثروت، حلیم و بردبار اور معاملہ فہم شخصیت تھے جیسا کہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے درج ذیل مکتوب سے اندازہ ہوتا ہے جو ان کی وفات پر آپ کو لکھا گیا:

عزیز از جان کو مناسب ہے کہ امور میں جس طور سے تمہارے والد ہر امر میں بردباری حلم اور طریقہ سے کام کرتے تھے آں عزیز بھی اختیار کریں اور خلاف حکم الٰہی کو ہرگز راہ نہ دیں۔[۲]

آپ کے جد امجد شہنشاہ اکبر کے زمانے میں ہندوستان آئے اور قصبہ رامپور منیہاران میں آباد ہو گئے[۳]۔ آپ نسباً انصاری ہیں اور حضرت ابو ایوب انصاری کے خاندان سے ہیں۔ آپ کا خاندان قصبہ رامپور میں ممتاز شمار ہوتا ہے۔ اس خاندان کے مورث اعلیٰ شیخ سالار بندگی تھے جن کا رامپور میں مزار موجود ہے۔ "حیات طیب" میں مرقوم ہے:

قصبہ رامپور میں مولانا حکیم ضیاء الدین صاحب کا خاندان ممتاز شمار ہوتا ہے۔ اس خاندان کے اہل علم اور اہل دل کافی شہرت رکھتے تھے۔ خود مولانا حکیم ضیاء الدین صاحب حضرت محمد ضامن شہیدؒ کے ہاتھ پر بیعت تھے اور آپ کے ارشد خلفاء میں شمار ہوتے تھے۔ اس خاندان کے مورث اعلیٰ حضرت شیخ سالار بندگی تھے جن کا رام پور میں مزار موجود ہے۔ سلسلہ نسب حضرت ابو ایوب انصاری صحابی رسول ﷺ تک پہنچتا ہے۔ جو مدینہ منورہ کے قبیلہ

---

[۱] مولانا امداد صابری، تذکرہ حافظ محمد ضامن شہید، ناشر: مولوی محمد شریف قاسمی سیالکوٹی، رفیق دفتر مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ، ۱۴۰۶ھ / ۱۹۸۶ء، ص: ۲۷۔

[۲] مولانا محمد وحید الدین رامپوری، مرقومات امدادیہ، مکتبہ برہان، نئی دہلی ۱۹۷۹ء، ص: ۲۳۔

[۳] تذکرہ حافظ محمد ضامن شہید، ص: ۲۷۔

خزرج سے تھے اور جہاں رسول ﷺ نے اوّلاً قیام فرمایا تھا۔[۴]

آپ دو بھائی تھے۔ چھوٹے بھائی حاجی علاء الدین ایک پختہ کار شاعر تھے۔ چنانچہ بطورِ یادگار ان کا ایک قطعۂ تاریخ "مونس مہجوراں" میں ملتا ہے[۵]۔ "حیات طیب" کے مطابق آپ کے یہاں اولاد نہ تھی البتہ حاجی علاء الدین کے تین صاحبزادے تھے اور انہی سے اس خاندان کی نسل چلی[۶]۔ لیکن مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی نے آپ کے ایک فرزند کا نام و تاریخ پیدائش ذکر کی ہے:

مولانا احمد بن مولانا حکیم ضیاء الدین رامپوری، ولادت ۱۲۸۲ھ / ۱۸۶۶ء۔[۷]

اسی طرح مولانا زکریا کاندھلویؒ نے امداد السلوک کے مقدمے میں لکھا ہے:

> حضرت حافظ صاحب (ضامن) نور اللہ مرقدہ کے سر مبارک پر شہادت کے وقت جو دستار مبارک تھی اس کے متعلق عزیزی مولوی مجتبیٰ رامپوری حال مقیم کراچی لکھتے ہیں: میرے پاس جو تبرکات ہیں ان میں دستار پر مبارک پر تاریخ شہادت ۲۴ محرم الحرام ۱۲۷۴ھ یوم دوشنبہ قلمی لکھی ہوئی ہے فقط۔ عزیزم مولوی مجتبیٰ، حضرت مولانا احمد صاحب رامپوریؒ بن حضرت مولانا حکیم ضیاء الدین صاحب کے صاحبزادے ہیں۔ حکیم صاحب نور اللہ مرقدہ حضرت حافظ صاحب کے خادم خاص اور خلیفہ مجاز تھے۔[۸]

غرض کہ آپ کے ایک فرزند مولانا احمد رامپوریؒ تھے اور ان کے بھی اولاد تھی جن میں ایک فرزند مولانا مجتبیٰ رامپوری تقسیم کے بعد کراچی منتقل ہوگئے تھے اور ان کے پاس دیگر تبرکات کے ساتھ حضرت حافظ محمد ضامن شہیدؒ کی وہ دستار بھی محفوظ تھی جو بوقت شہادت حضرت حافظ صاحب کے سر پر تھی۔ الغرض آپ کا خاندان علمی، روحانی اور نسبی ہر لحاظ سے نہایت معزز و باکرامت خاندان ہے۔

---

[۴] غلام نبی قاسمی و محمد شکیب قاسمی، حیات طیب، حجۃ الاسلام اکیڈمی، دیوبند، ۲۰۱۴ء، جلد اوّل، ص:۸۵۔

[۵] حکیم ضیاء الدین رامپوری، مونس مہجوراں مشمولہ در "تذکرہ حافظ محمد ضامن شہید"، ناشر: مولوی محمد شریف قاسمی سیالکوٹی رفیق دفتر مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ، ۱۴۰۶ھ / ۱۹۸۶ء، ص:۱۱۷۔

[۶] حیات طیب، ص:۸۴۔

[۷] مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی، تبرکات، مفتی الٰہی بخش اکیڈمی، کاندھلہ، ۱۹۷۲ء، ص:۵۳۔

[۸] مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، امداد السلوک اردو (مترجم: مولانا عاشق الٰہی میرٹھی)، دارالکتاب دیوبند، ۲۰۰۵ء، ص:۲۶۔

تعلیم: آپ کے تعلیمی کوائف کی تفصیل معلوم نہیں۔ صرف اتنا ہی پتہ چلتا ہے کہ آپ بلند پایہ عالم اور حاذق طبیب تھے۔ آپ کے ہاتھ میں اللہ تعالیٰ نے شفا دی تھی۔[9]

حافظ ضامن شہیدؒ سے بیعت: آپ کے شیخ اوّل حضرت حافظ ضامن علی تھانویؒ تھے جو کہ حضرت میانجی نور محمد جھنجھانویؒ کے ارشد خلیفہ تھے اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں شاملی کے محاذ پر داد شجاعت دیتے ہوئے مرتبۂ شہادت پر فائز ہوئے تھے۔ حضرت حافظ صاحبؒ پر چونکہ اخفائے حال کا غلبہ تھا اس لئے عموماً بیعت کم لیتے تھے۔ آپ کو بھی حضرت حاجی امداد اللہؒ کی سفارش پر بیعت کی۔[10]

سفر سلوک کی چند کیفیات: آپ نے حضرت حافظ صاحبؒ کی زیر نگرانی اسباقِ سلوک کا آغاز کیا۔ حضرت حافظ صاحبؒ کے یہاں تصور شیخ کی تاکید پائی جاتی تھی۔ اس بابت ایک مرتبہ آپ کے استفسار پر حضرتؒ نے فرمایا: ”کوئی بات تکرار کرنے کی نہیں۔ جس وقت محبت کا غلبہ ہوتا ہے خود بخود تصور بندھ جاتا ہے۔ کوئی کرے نہ کرے“۔

حافظ صاحب شہیدؒ سے خلافت و اجازت: آپ کو حضرت حافظ صاحب کی طرف سے اجازت و خلافت حاصل تھی آپ کا اکثر و بیشتر وقت حضرت حافظ صاحب سے بیعت ہونے کے بعد تھانہ بھون گزرتا۔ لیکن حضرتؒ نے آپ کو تھانہ بھون وطن بنانے سے منع کیا اور تجویز دی کہ کاندھلہ یا رامپور میں قیام کریں تو آپ نے رامپور کو ترجیح دی۔

حافظ صاحب شہیدؒ کے ساتھ آخری ایام میں رفاقت: حضرت حافظ صاحبؒ کو معرکۂ غدر سے قبل ہی اپنی شہادت کا علم ہو گیا تھا۔ آپ حضرت حافظ صاحب کے آخری ایام میں، معرکۂ جہاد میں اور حضرت کی تجہیز و تکفین اور جنازہ میں حاضر باش رہے۔

حافظ صاحب شہیدؒ کی شہادت کے بعد روحانی تربیت: حضرت حافظ صاحبؒ کی شہادت کے بعد ایک عرصہ تک آپ کسی سے بیعت نہ ہوئے۔ جب آپ حضرت حاجی امداد اللہؒ سے بیعت

---

(۹) تذکرہ حافظ محمد ضامن شہید، ص:۲۷۔

(۱۰) مونس مہجوراں، ص:۱۰۱۔

ہوئے اور اپنے ظاہری اور باطنی معاملات میں تربیت لینے لگے تو ان کیفیات سے مغلوب ہو کر حضرتؒ سے ہجرت کی اجازت چاہی۔ لیکن حضرت حاجی صاحبؒ کی طرف سے آپ کو اجازت نہ ملی۔ اس بابت حضرت حاجی صاحبؒ نے جو خط لکھا، ملاحظہ ہو:

قصد ہجرت کے بارہ میں جو کچھ لکھا تھا تو اے عزیز از جان اس سے کیا بہتر۔ خدائے تعالیٰ مبارک کرے۔ مگر اے عزیز اس وقت جو احوال مہاجرین کے دیکھے جاتے ہیں اس پر حسرت وافسوس آتی ہے۔ یعنی جو صلاحیت و دینداری ہند میں رکھتے تھے یہاں آکر اکثر اس میں نقصان واقع ہو جاتا ہے۔ خصوصاً عبادت و ذکر و شغل الٰہی میں زیادہ خلل پڑ جاتا ہے اور سوائے فکر شکم و فرج کچھ باقی نہیں رہتا۔ پس اے عزیز اوّل ہجرت اوصاف ذمیمہ سے اوصاف حمیدہ کی طرف ہونا چاہیے۔ جیسے توکل و قناعت و رضا و تسلیم وغیرہ کہ دائمی فرض ہے تاکہ ظاہری ہجرت درست ہو سکے۔ اس لئے کہ بدوں اوّل ہجرت کے دوسری ہجرت ٹھیک نہیں ہوتی۔ لہٰذا احقر اس امر میں کہ نازک مقدمہ ہے کچھ نہیں کہتا ہے۔ نہ منع کرتا ہوں نہ اجازت دیتا ہوں مگر یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اپنے ارادہ کو دل میں جما کر بہر حال بجناب صفت ایجابی ملتجی ہو اور استخارے کرتے رہیں کہ اے اللہ العالمین اگر یہ امر خیر ہم جیسے ضعیفوں اور عاصیوں کے حق میں بہتر ہو اور آپ راضی ہوں تو اس امر خیر کا سامان مہیا کیجئے۔ ورنہ جس جگہ رکھیں اپنی رضا واتباع شریعت میں رکھیں اور اسی میں ماریں اور اسی میں اٹھائیں۔ آمین۔ پس اگر علم الٰہی میں تمہارے حق میں بہتر ہو گا خود بخود حسب دلخواہ سامان جمع ہو جائے گا ورنہ تمہاری کوشش لاحاصل ہے۔[11]

حاجی صاحب سے خلافت و اجازت: ایک عرصہ حضرت حاجی صاحبؒ کے زیر نگرانی مقامات سلوک طے کیے اور درجۂ کمال پر فائز ہوئے۔ چونکہ آپ کو حضرت حافظ صاحبؒ سے بھی اجازت وخلافت تھی، اس لئے حضرت حاجی صاحبؒ نے بھی آپ کو خرقۂ خلافت عنایت فرماتے ہوئے حضرت حافظ صاحبؒ کا جانشین مقرر کیا۔ حضرت حاجی صاحبؒ نے نہ صرف آپ کو خلافت دی بلکہ حضرت حافظ صاحبؒ کا جانشین مقرر فرمایا اور متعدد مکتوبات میں اس کی تصریح فرمائی کہ آپ حضرت حافظ صاحبؒ کی جگہ ہیں۔ نیز آپ کو حضرت حافظ صاحبؒ کے صاحبزادے حافظ یوسف

[11] مرقومات امدادیہ، ص: ۲۲۔۲۳۔

تھانویؒ کا سرپرست بھی مقرر کیا۔

تعلیم سالکین کی تلقین: آپ کو حضرت حاجی صاحبؒ نے با اصرار سلسلے کی اشاعت کی تلقین کی اور بہت سے متعلقین کو آپ سے تربیت واصلاح لینے کا حکم فرمایا۔

نسبت باطنی: "مرقومات امدادیہ" کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ پر عشق ومحبت کا کھلا غلبہ تھا اور آپ ہمہ وقت عشق الٰہی میں بے تاب رہتے تھے۔ اسی بنا پر آپ اپنے والد کے ترکے سے دستبردار ہوئے اور اسی بنا پر ہی آپ کا ملازمت میں بھی جی نہ لگا۔ اور اسی بنا پر حضرت حاجی صاحبؒ نے آپ کو صبر وقناعت کی تعلیم کرکے گوشۂ تنہائی میں طالبین کی اصلاح وتربیت میں مشغول ہونے کی تلقین کی۔

مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے ربط وتعلق: آپ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے ہم عصر اور بے تکلف دوست تھے۔ مولانا عاشق الٰہی میرٹھی آپ کی بے تکلفی کا حال یوں بیان کرتے ہیں:

> حکیم صاحب تشریف لاتے تو بے تکلف حضرت کی چارپائی پر لیٹتے اور بیٹھتے تھے۔ حضرت ہی کی چوکی پر وضو کرتے اور وہیں نوافل پڑھتے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ حکیم صاحب حضرت کی چارپائی پر بے تکلف لیٹ جاتے اور حضرت پٹی کے برابر نیچے فرش پر بیٹھ کر راز ونیاز کی باتیں فرمایا کرتے۔ مگر اس کے ساتھ ہی حکیم صاحب کو ادب اس درجہ ملحوظ تھا کہ جس کا سمجھنا اس سادہ برتاؤ پر مشکل ہے۔ جس احترام کی وقعت کی نگاہ سے حکیم صاحب کو امام ربانی دیکھتے تھے اس کی مثال عام متوسلین میں بھی نہیں مل سکتی۔ [۱۲]

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد مولانا رشید احمد گنگوہیؒ ایام روپوشی میں آپ کے یہاں قصبہ رامپور میں بھی کچھ روز مقیم رہے اور آپ ہی کے گھر سے گرفتار ہوئے [۱۳]۔ حضرت حاجی امداد اللہؒ نے آپ کو روحانی معاملات میں مولانا گنگوہیؒ سے تربیت ومشاورت کا حکم دیا تھا۔ [۱۴]

حضرت حاجی امداد اللہؒ کو آپ سے اور مولانا گنگوہیؒ سے جس درجہ کا حسن ظن تھا اس کا اندازہ

---

[۱۲] مولانا عاشق الٰہی میرٹھی، تذکرۃ الرشید، بلالی سٹیم ساڈھورہ، جلد اوّل، ص: ۲۰۱۔ ۲۰۲۔

[۱۳] ماخذ سابق، ص: ۸۲۔

[۱۴] مرقومات امدادیہ، ص: ۲۳۔

درج ذیل اقتباس سے ہوتا ہے جو ان حالات کے پس منظر میں لکھا گیا جب بعض فتنہ پرور لوگوں نے حضرت حاجی صاحبؒ اور مولانا گنگوہیؒ کے درمیان فضا کو خراب کرنا چاہا تھا۔ حضرت حاجی صاحبؒ لکھتے ہیں:

بخدمت عزیزم حکیم ضیاء الدین مکرر یہ کہ جو کچھ آپ نے اپنے اور مولوی (رشید احمد گنگوہی) صاحب کے بارہ میں لکھا تھا۔ عزیز من! ان عزیزوں کی نسبت میں کسی کے کہنے سننے کا اعتبار نہیں کرتا ہوں۔ فقیر کو تمہاری نسبت حسن ظن عین الیقین کے درجہ پر پہنچ گیا ہے اور تم کو مع دوستان خدا کے یک جان و دل و شیر و شکر جانتا ہوں اور نیز تمہاری محبت کو اپنی نجات کا وسیلہ گمان کرتا ہوں۔ چہ جائیکہ ملال ہو خاطر جمع رکھیں اور آپس میں اتحاد و محبت و اتفاق سے اپنے کام میں رہیں۔[(۱۵)]

اسفار حج: آپ نے مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی معیت میں دو حج بالترتیب ۱۲۸۰ھ / ۱۸۶۴ء[(۱۶)] اور ۱۲۹۴ھ / ۱۸۷۷ء[(۱۷)] میں کیے۔ پہلے حج میں جہاز کو شدید سمندری طوفان کا سامنا ہوا۔ یہاں تک کہ کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ جب طوفان کی شدت کم ہوئی اور مطلع صاف ہوا تو معلوم ہوا کہ ایک رات میں بہت سی مسافت طے ہو گئی ہے۔[(۱۸)]

نکاح: آپ کا پہلا نکاح ۱۶ جمادی الآخر ۱۲۶۷ھ / ۱۱ مارچ ۱۸۵۱ء میں ہوا[(۱۹)] اور ۱۲۸۰ھ / ۱۸۶۴ء میں آپ کی اہلیہ عمدۃ النساء عرف عمداً کا انتقال ہو گیا[(۲۰)]۔ آپ نے ان کے انتقال کے بعد اپنے نکاح ثانی کی بابت حضرت حاجی امداد اللہؒ سے مشورہ کیا تو حضرت حاجی صاحبؒ نے آپ کو کسی بیوہ سے نکاح کرنے کی تلقین فرمائی۔ اس سلسلے میں حضرت حاجی صاحب لکھتے ہیں:

عزیزہ عمداً (عمدۃ النسا) مرحومہ کے انتقال سے البتہ رنج ہے کہ اپنے تمام اقربا پر رنج والم کا داغ

---

(۱۵) ماخذ سابق، ص:۲۱۔

(۱۶) تذکرۃ الرشید، ص:۲۰۱۔

(۱۷) ماخذ سابق، ص:۲۳۰۔

(۱۸) مونس مہجوراں، ص:۱۴۵۔۱۴۶۔

(۱۹) تبرکات، ص:۴۸۔

(۲۰) مرقومات امدادیہ، ص:۲۷۔۲۸۔

دے کر چلی گئی انا للہ وانا الیہ راجعون۔ خداوند تعالیٰ تمام عزیزوں کو صبر نصیب کرے اور نعم البدل اس کا عنایت فرمائے آمین۔ اور مقدمہ نکاح میں علماء کے ارشاد پر عمل کرنا چاہیے۔ مگر فقیر کے خیال میں بیوہ سے بہتر معلوم ہوتا ہے لیکن عزیز کو مناسب ہے کہ علماء کے حکم کو مقدم رکھیں۔[۲۱]

چنانچہ آپ نے اپنی بیوہ ممانی حفیظ النسا عرف حفیظاً سے نکاح کیا[۲۲]۔ کیونکہ ہندو سماج کے زیر اثر مسلمانوں میں بھی بیوہ کا نکاح معیوب سمجھا جاتا تھا اس لئے آپ کو بھی طعن وتشنیع کا سامنا کرنا پڑا کہ ایک تو بیوہ اور پھر حقیقی ممانی سے نکاح کر لیا ہے۔ اس بابت حضرت حاجی صاحبؒ ایک مکتوب میں آپ کی داد وتحسین کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ آپ نے کفر کی رسم اور قید بد کو خاندان سے دور کیا ہے:

عزیزم محمد علی کے خط سے معلوم ہوا کہ کہ عزیز نے بی حفیظاً سے نکاح کیا ہے۔ بہت خوش ہوا۔ الحمد للہ کفر کی رسم اور قید بد ہمارے خاندان سے دور ہوئی۔ خداوند تعالیٰ ہر دو کو جزائے خیر دے اور اپنے ذوق وشوق اور اتباع شریعت میں مستقیم رکھے اور اللہ ورسول کی خلاف مرضی سے دور رکھے۔[۲۳]

اس نکاح میں سب سے زیادہ مخالفت منکوحہ کی حقیقی بہن سعید النسا نے کی تھی۔ چنانچہ حضرت حاجی صاحبؒ نے ایک خط میں ان کو تنبیہ کرتے ہوئے لکھا: "جب تک تم اپنی بہن کو راضی نہ کرو گی اور اللہ سے نہ ڈرو گی تب تک تم سے میں بھی خوش نہ ہوں گا۔"[۲۴]

ملازمت: حضرت حاجی صاحبؒ کے خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے اپنے والد کے ترکے کو چھوڑ دیا تھا۔[۲۵] بعد ازاں آپ کو ریاست بھوپال میں بطورِ طبیب ۴۰؍روپے پر مشاہرہ ملازمت کی پیشکش ہوئی جو آپ نے امراء سے قربت کی بنا پر اوّلاً قبول نہ کی لیکن حضرت حاجی صاحبؒ نے

---

[۲۱] ماخذ سابق۔

[۲۲] ماخذ سابق۔

[۲۳] ماخذ سابق۔

[۲۴] ماخذ سابق، ص:۱۷۔

[۲۵] ماخذ سابق، ص:۲۵۔

اس ملازمت کو قبول کرنے کی تجویز دی۔[۲۶] آپ ملازمت قبول نہیں کرنا چاہتے تھے مگر حضرت حاجی صاحبؒ کی تجویز پر یہاں ملازمت کی مگر اپنی طبیعت پر قابو نہ رکھ سکے اور تشویش میں مبتلا رہے۔ آخر مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے مشورہ سے ملازمت ترک کردی اور اپنے وطن رامپور میں گوشہ نشین ہو کر حضرت حاجی صاحبؒ کے حکم سے اصلاح وارشاد میں مشغول ہوگئے۔[۲۷] آپ ۱۳۰۵ھ / ۱۸۸۸ء سے ۱۳۱۲ھ / ۱۸۹۵ء تک دار العلوم دیوبند کی شوریٰ کے رکن بھی رہے۔[۲۸]

قلمی یادگار: آپ کی قلمی یادگار میں ایک مختصر رسالہ "مونس مہجوراں" ہے جو اپنے شیخ اوّل حضرت حافظ صاحبؒ شہیدؒ کے تذکرہ میں ۴ ربیع الثانی ۱۲۸۴ھ / ۱۵ اگست ۱۸۶۷ء کو مکمل کیا[۲۹]۔ اس رسالہ کی دستیاب قلمی نقل 16 / 20x30 کے ۲۷ صفحات پر مشتمل ہے جو مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ کے کتب خانہ میں موجود ہے[۳۰]۔ آپ نے ایک نقل تیار کرا کر حضرت حاجی امداد اللہؒ کی خدمت میں روانہ کی تھی اور حضرت حاجی صاحب کا کتب خانہ ان کی وفات کے بعد مدرسہ صولتیہ کا حصہ بن گیا تھا۔ اس قلمی نسخہ کے کاتب حافظ ضامن شہیدؒ کے مرید عبد الرحمٰن رامپوری ہیں۔[۳۱]

اس رسالے میں باب یا فصل کی جگہ نکتہ کی اصطلاح ایجاد کی گئی ہے۔ یوں یہ رسالہ ۳۲ نکتوں پر مشتمل ہے۔ اس کی تاریخی اہمیت یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے مطالعہ کے سلسلے میں سب سے قدیم اور پہلا ماخذ یہی رسالہ ہے۔ اس کے بارے میں ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری لکھتے ہیں:

> اگرچہ اس میں معرکۂ شاملی کے تاریخی واقعے کی تفصیل تو نہیں ہے لیکن حضرت ضامن کی صحیح تاریخ شہادت اور شہادت کا تذکرہ ہے۔ نیز اس وحشت انگیز حالات پر اس سے روشنی پڑتی ہے۔[۳۲]

---

[۲۶] ماخذ سابق، ص:۱۰۲۔

[۲۷] ماخذ سابق، ص:۱۰۳۔۱۰۴۔

[۲۸] تذکرہ حافظ محمد ضامن شہید، ص:۴۱۔

[۲۹] ماخذ سابق، ص:۱۲۔

[۳۰] ماخذ سابق۔

[۳۱] ماخذ سابق، ص:۵۵۔

[۳۲] بزرگان دیوبند اور جہاد شاملی، ص:۵۵۔

یہ رسالہ چند ادبی مشمولات کی وجہ سے بھی نہایت اہم ہے، مثلاً:

۱۔ اس رسالے میں مولانا یعقوب نانوتویؒ کا لکھا ہوا حضرت حافظ صاحبؒ کا منظوم حلیہ شامل ہے جو ۱۰۹ اشعروں پر مشتمل ہے۔ اس منظومے کا سوائے اس رسالے کے کوئی اور ذکر نہیں ہے۔

۲۔ اسی طرح اس رسالے میں مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کا لکھا ہوا حضرت حافظ صاحبؒ کا مرثیہ بھی موجود ہے جو ۶۵ شعروں پر مشتمل ہے۔ مرثیہ مؤلف کے نام سے ہی لکھا گیا ہے مگر مؤلف نے حضرت شاعر کے شکریہ کے ساتھ اسے رسالے کی زینت بنایا ہے۔ چنانچہ یہ مرثیہ بعدازاں ''قصائد قاسمی'' کا بھی حصہ بنا۔

۳۔ ایک قطعۂ تاریخ مؤلف کے برادر حقیقی علاء الدین رامپوریؒ کا تحریر کردہ ہے۔ جس سے حضرت حافظ صاحب کی نہ صرف تاریخ شہادت بلکہ وقت، دن اور مزار کا بھی علم ہوتا ہے۔

۴۔ ایک قطعۂ تاریخ مولانا عبدالسمیع بیدل رامپوریؒ کا تحریر کردہ ہے جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ شاملی کا معرکہ نصاریٰ سے پیش آیا تھا۔ نیز مولانا بیدل کے دو فارسی شعر بھی بطورِ یادگار شامل ہیں۔

۵۔ ایک قطعۂ تاریخ ملا زین العابدین عابد پشاوری کا تحریر کردہ ہے جس سے شہادت کا دن، مہینہ، تاریخ اور وقت معلوم ہوتا ہے۔

۶۔ ایک قطعۂ تاریخ مولوی مظہر الدین رامپوری کا شامل ہے جس سے رسالے کی تکمیل کا علم ہوتا ہے۔

ان کے علاوہ چند مزید شخصیات کے قطعات تاریخ بھی شامل ہیں۔ حضرت حاجی امداد اللہؒ کی خدمت میں جب یہ رسالہ پہنچا تو آپ نے لکھا:

> رسالہ کہ حالات میں حضرت حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے آپ نے لکھا ہے، پہنچا۔ اس کے مطالعہ سے بہت خوش ہوا۔ اس کے ہر حرف سے پیروں کی بوئے محبت آتی ہے۔ خدا تعالیٰ مقبول فرمائے۔ عزیز من! مرشد کی محبت عین خدا اور سول کی محبت ہے کہ نائب ان کے ہیں۔[۳۳]

یہ رسالہ تقریباً ایک صدی تک گمنام رہا۔ مولانا نسیم احمد فریدی نے اس کے بارے میں ایک مختصر تعارفی مضمون ماہنامہ ''تذکرہ'' دیوبند (نومبر ۱۹۶۱) میں شائع کیا۔۔ اس رسالے کو ۱۹۷۹ء

---

[۳۳] مرقومات امدادیہ، ص:۷۷۔

میں مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی نے دریافت کیا اور مولانا امداد صابری نے اسے مؤلف اور صاحب سوانح کے مختصر حالات کے ساتھ مزین کرکے "سردار شہیداں" کے نام ۱۹۸۲ء میں محمد حشیم صاحب نائب مہتمم مدرسہ صولتیہ کی جانب سے شائع کیا۔

حضرت حاجی امداد اللہؒ کے ایک خط سے ہمیں یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے ایک اور رسالہ "قول فیصل" کے نام سے بھی تحریر کیا تھا۔ چنانچہ حضرت حاجی صاحب لکھتے ہیں:

رسالہ قول فیصل آں عزیز کی تصنیف پہنچی۔ اوّل سے آخر تک مطالعہ کیا۔ دلائل عقلی و نقلی کو خوب پایا۔ اللہ تعالیٰ عالم کو اس سے ہدایت کرے۔ مگر بظاہر خرخشہ سے خالی نہیں۔ اس لئے کہ جہاں سے انصاف اٹھ گیا ہے اور جنگ و جدال قائم ہو گیا، جو مخالفین ہیں اس کے دیکھنے سے ان کے حسد کی آگ اور شعلہ زن ہو گی اور جو موافق ہیں ان کیلئے بحث و مباحثہ کی سپر ہاتھ میں آئے گی اور یہ فضول ہے۔ پس فقیر کو چاہیے کہ گوشہ خاموشی میں بیٹھ کر اپنے کام میں مشغول ہو اور حال و قال کو اس کے اہل کے حوالہ کرنا چاہیے کہ فقیر کی نصیحت و ہدایت فعلی ہے اور عالم کی نصیحت وہدایت قولی ہے۔[۳۴]

لیکن اس رسالہ کا کہیں اور ذکر نہیں ملتا۔ البتہ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کا "فرق مراتب" سے متعلق ایک طویل فارسی مکتوب ملتا ہے جو "فرائد قاسمیہ" میں شامل ہے، اس کے آغاز میں یہ عبارت درج ہے: "حسب درخواست جناب حکیم ضیاء الدین صاحب ثبّتہ اللہ و ایانا علی الصراط المستقیم جو بندہ کے مخدوم و مکرم ہیں طبع نارسا، یوں متقاضی ہے کہ درباب تفضیل علم یا عبادات ایک قول فیصل ایسا واضح لکھئے کہ جس سے خلجان یکلخت اہل انصاف کے دل سے اڑ جائے۔"[۳۵]

ممکن حضرت حاجی صاحبؒ کے خط میں اسی "قول فیصل" کا ذکر ہو۔ آپ نے ۲۸/ رمضان المبارک ۱۳۱۲ھ / کو ۲۳/ مارچ ۱۸۹۵ء انتقال کیا۔[۳۶]

---

[۳۴] ماخذ سابق، ص:۶۸۔

[۳۵] مولانا نسیم احمد فریدی، فرائد قاسمی مشمولہ در "مقالات حجۃ الاسلام"، ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان، ۱۴۴۱ھ، جلد: ۱۲، ص:۶۸۔

[۳۶] تذکرہ حافظ محمد ضامن شہید، ص:۱۴۱۔

فارغین مدارس عربیہ اور اردو

ڈاکٹر ظفرالاسلام خان

”اردو ادب“ سہ ماہی (شمارہ جولائی-دسمبر ۲۰۲۵) میں صدف فاطمہ صاحبہ کا مضمون ”دینی مدارس کے فارغین اور یونیورسٹی کے نظام میں اردو درس و تدریس“ شائع ہوا ہے۔ اس کا ایک ورژن انقلاب دہلی (یکم جون ۲۰۲۵ء) میں بھی شائع ہوا ہے[۱]۔ عنوان کے لحاظ سے اس مضمون میں دینی مدارس کے فارغین کے ہندوستانی یونیورسٹیوں کے اردو شعبوں میں داخلے اور اس کے فوائد و نقصانات پر بحث کرنا مقصود تھا لیکن اس مضمون میں آدھے سے زیادہ جگہ غیر متعلق باتوں کو دی گئی ہے مثلاً مختلف عالمی زبانوں کے آداب، ”ادبی کلچر“، ”اردو ادب کا خلقیہ“ (معلوم نہیں ”خلقیہ“[۲] کیا چیز ہے؟)، ”اردو کلچر“، امراء کا تہذیب سیکھنے کے لئے اپنے بچوں کو طوائفوں کے پاس بھیجنے کا مزعومہ، زمیندارانہ نظام، اشراف کی مریضانہ زندگی، لکھنوی کلچر، کائستھوں کا ظاہرہ، جھوٹا دعویٰ کہ عربی اور فارسی کے نوّے فیصد الفاظ کے تلفظ اور معنی اردو میں بدل گئے ہیں، دعویٰ کہ اردو کے مستند محاوروں کی سند خواتین سے لی جاتی تھی، دعویٰ کہ ہندوستان میں پٹھان ابھی بھی اپنے گھروں میں پشتو اور دری وغیرہ بولتے ہیں (میں نے مختلف ایسے علاقوں جیسے بریلی، بارہ بستی اور رام پور سے تحقیق کی تو معلوم

---

(۱) اس تحریر کے لکھنے کے بعد میرے علم میں آیا کہ کچھ مدارس کے فارغین یا مؤیدین مذکورہ تحریر لکھنے والی خاتون کے خلاف انتہائی غلیظ اور شرمناک تبصرے فیس بک وغیرہ پر کر رہے ہیں۔ ایسے لوگ ملت اور مدارس دونوں کے لئے کلنک ہیں۔ میں اس گراوٹ کی سخت مذمت کرتا ہوں۔ عام حالات میں ایسی حرکتوں کے بعد یہ تحریر نہیں چھپتی لیکن چونکہ یہ ایک عمومی مسئلہ ہے اور فارغین مدارس کا یہ عمومی کردار نہیں ہے، اس لئے یہ تحریر چھاپی جا رہی ہے۔

(۲) تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ ”خلقیہ“ ایتھوس Ethos کا ترجمہ ہے جو صحیح نہیں ہے کیونکہ ”ایتھوس“ ان معتدل مثالی آئیڈیلز اور عقائد کو کہتے ہیں جو کسی سماج کو راہ دکھاتے ہیں جبکہ ”خلقیہ“ سے یہ تصور نہیں ابھرتا۔ مزید برآں ”خلقیہ“ میں حرف خاء کو تین طرح سے پڑھا جا سکتا ہے یعنی زیر، زبر اور پیش سے اور ان تینوں صورتوں میں اس کا معنی مختلف ہو گا۔

ہوا کہ یہ صد فیصد من گھڑت ہے)، جدید ہندی، امریکہ نے ماہرین لسانیات پر قارون کے خزانے کھول دیے (معلوم نہیں یہ کب اور کہاں ہوا؟)، سید حامد کے اپنے زمانے میں علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے دروازے دینی مدارس کے فارغین کے لئے کھولنے کو مرادآباد فساد سے جوڑا گیا ہے اور سید حامد کو ''اندرا گاندھی کے قریب ترین لوگوں میں شمار ہوتے تھے'' بتایا ہے جو ایک انکشاف ہے، سید حامد کے اس فیصلے کو سیاسی مقاصد سے تعلیم کے میدان میں کیا گیا فیصلہ بتایا گیا ہے (کس ملک میں تعلیم سیاست سے الگ ہے؟) اور اس کو ''نہایت منفی اور دوررس تخریبی نتائج کا حامل'' بتایا گیا ہے (اس کی کوئی دلیل نہیں)، دعویٰ کہ جنرل ضمیر الدین شاہ نے ایک شخص کو (جو انگریزی میں پی ایچ ڈی ہے، بیسیوں کتابوں کا مصنف ہے اور مفکر کی حیثیت رکھتا ہے) کو ''ایک متنازعہ فیصلے کے ذریعے انگریزی ادب کا براہِ راست پروفیسر بنانے'' کے لئے برج کورس شروع کیا (جو جھوٹ اور بہتان ہے اور براہ راست کسی کو پروفیسر بنانے کی یہ واحد مثال نہیں ہے)، دعویٰ کہ دینی مدارس کے فارغین اردو ادب سے نابلد ہوتے ہیں، جامعہ اردو کے کورس کی بڑی تعریف کی گئی ہے لیکن اس میں وہ ''سماجی علوم'' کہاں ہیں جن کو مضمون نگار مدارس کے نصاب میں داخل کرنے کی وکالت کر رہی ہیں؟ یہ مشتے از خروارے کچھ نمونے ہیں جو اس چھوٹے سے مضمون میں دیکھنے کو ملے۔

مذکورہ مضمون میں یہ بھی دعویٰ کیا گیا ہے کہ ''حکومت ہند کے پیش کردہ اعداد و شمار کے مطابق سن ۲۰۰۲ میں تقریباً پانچ لاکھ کل وقتی دینی مدارس تھے جن میں تقریبا پانچ کروڑ طالب علم زیر تعلیم تھے''۔ یہ دعویٰ مکمل طور سے بے بنیاد ہے۔ حکومت ہند نے ایسے کوئی اعداد و شمار جاری نہیں کیے ہیں اور ''پانچ کروڑ'' طلبہ کا مدارس میں تعلیم پانا ایک ہمالیائی جھوٹ ہے جبکہ پورے ہندوستان میں تعلیم پانے والے مسلم طلبہ کی کل تعداد بھی اتنی نہیں ہے! ''پانچ کروڑ'' کی تعداد اس وقت قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر حمید اللہ بھٹ کی ایجاد ہے جو قومی آواز (۲۲/اپریل ۲۰۰۳) میں شائع ہوئی تھی اور جسے ارجمند آرا نے اپنے مضمون Madaris and Making of

Muslim Identity(ایکونومک اینڈ پولیٹیکل ویکلی، ۳۰؍ جنوری ۲۰۰۳ میں نقل کیا ہے)۔ اسی کا حوالہ مدارس سے خوفزدہ سیکولر حضرات دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ حکومت ہند کے جاری کردہ اعداد وشمار نہیں ہیں۔ ہندوستان میں مدارس میں جانے والے طلبہ کے حوالے سے دستیاب واحد سرکاری اعداد و شمار سچر کمیٹی کی رپورٹ میں فراہم کیے گئے ہیں، جو صفحہ ۲۹۳ پر بتاتی ہے کہ اپریل ۲۰۰۶ میں بھارت میں مدارس میں پڑھنے والے طلبہ کی کل تعداد ۱۰۳۵۳۸۴ تھی (یعنی دس لاکھ سے ذرا سازیادہ) اور یہ اعداد و شمار سچر رپورٹ (ص:۷۷) کے مطابق ان سی آر ٹی کے ۲۰۰۲ کے سروے کے مطابق ہے جو بہر حال ایک سرکاری سروے ہے۔ سچر رپورٹ (ص:۷۷) کے مطابق صرف تین فیصد مسلم بچے مدرسوں میں پڑھتے ہیں۔ سچر رپورٹ (ص:۷۷) میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ عمومی اعتقاد غلط ہے کہ بہت زیادہ مسلم بچے مدارس میں پڑھتے ہیں۔ یہ سرکاری تعداد ممکن ہے کہ حقیقت سے کچھ کم ہو لیکن کسی بھی اندازے سے اس کا پانچ کروڑ تک پہنچ جانا عقل سے ماوراہے! بھارت میں جماعت اوّل تا بارہویں جماعت میں پڑھنے والے مسلم طلبہ کی کل تعداد ۳۶.۵۹ ملین تھی، جیسا کہ ۲۰۱۳-۱۴ ۲۰ سے ۲۰۲۱-۲۰۲۲ کے درمیان درج کیا گیا ہے (ماخذ : https://educationforallinindia.com/share-of-muslim-enrolment-at-school-education-in-india-2012-13-to-2021-22/)۔ دوسرے لفظوں میں پورے ہندوستان میں سارے مسلم طلبہ کی تعداد چار کروڑ بھی نہیں ہے۔ سچر رپورٹ (صفحہ ۷۵ ومابعد) میں دیے گئے دو مختلف اندازوں کے مطابق صرف ۳تا۴ فیصد ہندوستانی مسلم طلبہ مدارس میں داخل تھے، جبکہ ۶۶ فیصد طلبہ سرکاری اسکولوں میں اور ۳۰ فیصد طلبہ نجی اسکولوں میں زیر تعلیم تھے (صفحہ ۷۵)۔ تو پھر کس بنیاد پر یہ دعویٰ کیا جاسکتاہے کہ ۲۰۰۳ میں "پانچ کروڑ" مسلم طلبہ مدارس میں پڑھ رہے تھے!

مذکورہ مضمون میں ہندوستانی مدارس کی تعداد "پانچ لاکھ" بتائی گئی ہے، جس کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ مدارس کی تعداد کے کوئی سرکاری اعداد و شمار موجود نہیں ہیں لیکن غیر سرکاری اعداد و شمار ہندوستانی مدارس کی تعداد زیادہ سے زیادہ پینتیس ہزار سے پچاس ہزار بتاتے ہیں

(https://iasnext.com/madrasas-in-india-upsc/)۔

مضمون نگار کے خیال میں اسکولوں میں پڑھائی جانے والی اردو، یونیورسٹیوں میں بی اے اور ایم اے میں داخلے کے لئے مناسب ہے لیکن ہمارا تجربہ ہے کہ اسکولوں میں اردو پڑھنے والے بچوں کو کچھ اردو نہیں آتی ہے (یہ میرا اپنے بچوں کے ساتھ تجربہ ہے جن کو میں نے "اچھے" اسکولوں سے نکال کر جامعہ اسکول میں ڈالا تھا جہاں اردو بھی پڑھائی جاتی تھی)۔ جس " اردو ادب" کی فاضل مضمون نگار بات کر رہی ہیں وہ اسکولوں میں نہیں پڑھایا جاتا بلکہ کالج اور یونیورسٹی میں پڑھایا جاتا ہے اور اس کو سمجھنا اسکولوں میں اردو پڑھنے والے بچوں کے لئے ناممکن ہے جبکہ مدارس کے فارغین کے لئے ان کو سمجھنا قطعاً مشکل نہیں ہوتا۔

مدارس کے فارغین کے یونیورسٹیوں میں داخلے کا حل مضمون نگار نے "ایک، دو اور تین سال" کا کورس بتایا ہے جس میں مختلف مضامین بالخصوص Humanities اور سوشل سائنس (کیا یہ Humanities میں نہیں ہے؟) کے مضامین شامل ہوں اور یہ بھی تجویز دی ہے کہ اس کے اخراجات یونیورسٹیاں برداشت کریں (موجودہ حالات میں تو یہ بہت دور کی بات ہے ہی، لیکن کیا عام حالات میں بھی ایسا ممکن ہے؟)۔

مضمون میں متعدد الفاظ بہت کھٹکے، مثلاً "معرّب" تو سنا اور پڑھا تھا لیکن "مفرّس"[۳] پہلی بار دیکھا۔ ٹرینڈاد [ٹرینیڈاڈ] اینڈ ٹوبیکو (انگریزی میں بھی Tobacco ہی لکھا گیا ہے!)۔ یہ کس ملک کا نام ہے مجھے نہیں معلوم۔ شاید وہاں تمبا کو بہت پیدا ہوتا ہو گا! ایک لفظ "اونرس" (!!) بھی نظر کو کھٹکا جس کو ہم اردو میں آجتک "آنرز" کی شکل میں لکھا ہوا دیکھتے تھے، اب یہ نئی شکل سامنے آئی ہے۔ شائد اس کے پیچھے بھی کوئی بڑا ادبی و تحقیقی راز ہو گا۔

مضمون کے پیچھے دراصل مدارس عربیہ اور ان کے فارغین سے الرجی چھپی ہوئی ہے۔ مضمون نگار اور ان کے منٹر (گرو) یہ ماننے کو تیار نہیں ہیں کہ مدرسوں کی وجہ سے ہی آج ہندوستان میں اردو زندہ ہے۔ اسی کے فارغین اردو لکھتے، پڑھتے اور بولتے ہیں۔ ان کے علاوہ اردو والے تو زیادہ

---

[۳] مفعّل کے وزن پر اس لفظ کی ترکیب عربی ہے لیکن معتبر عربی ڈکشنریوں جیسے لسان العرب، المعجم الوسیط اور لین کی Lexicon وغیرہ میں "مفرس" لفظ موجود نہیں ہے البتہ یہ لفظ فارسی زبان میں مستعمل ہے۔

سے زیادہ صرف اردو بول لیتے ہیں جبکہ ان کا سارا کام در حقیقت انگریزی، ہندی یا دوسری علاقائی زبانوں میں ہوتا ہے۔ آج اردو کی مطبوعات پڑھنے اور خریدنے والے مدرسہ کے فارغین ہی ہیں۔ وہ نہ ہوتے تو سارے اردو اشاعتی ادارے اور مجلات بند ہو جاتے۔ دوسرے اردو والے چاہے وہ اکیڈمیوں میں ہوں یا انجمنوں میں یا یونیورسٹیوں کے شعبہ ہائے اردو میں، وہ اردو کے نام پر روزی ضرور کمارہے ہیں لیکن وہ اردو کا حق ادا نہیں کر رہے ہیں بلکہ وہ اردو کی کتابیں اور مجلات بھی خرید کر نہیں پڑھتے ہیں۔

مضمون میں یہ افسانہ بھی دہرایا گیا ہے کہ مدرسے کے فارغین اردو کی خدمت نہیں کر رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو صحافت، تحقیق، ادب، شعر، ترجمہ، تدریس وغیرہ مدارس کے فارغین کے ہی دم سے باقی ہے۔ پرانے علماء کو چھوڑ دیں، میں یہاں صرف چند معاصر نام گناؤں گا جن کی بدولت آج اردو زندہ ہے: حقانی القاسمی، الطاف احمد اعظمی، وارث مظہری، پروفیسر ابو بکر عباد، قاضی جمال قاسمی، پروفیسر خواجہ اکرام الدین، پروفیسر شہاب ظفر اعظمی، عمیر منظر، ڈاکٹر مشتاق تجاروی، رضی الاسلام ندوی، عنایت اللہ سبحانی، پروفیسر شمس کمال، عمیر الصدیق ندوی، علیم اشرف جائسی، عطاء الرحمن قاسمی، محمد علم اللہ وغیرہ وغیرہ۔۔۔ لسٹ بڑی لمبی ہے۔

ایک آخری بات: مدرسوں کے فارغین کے براہ راست یونیورسٹیوں کے اردو شعبوں میں داخلے کی اتنی سخت مخالف مضمون نگار صاحبہ خود ایک مدرسے کی فارغ ہیں اور فراغت کے بعد انھوں نے وہی راستہ اپنایا ہے جس کی وہ شدومد سے مخالفت کر رہی ہیں! یاللعجب!

اسلامی نظامِ تعلیم

مولانا سید ریاست علی ندوی

اس کتاب میں اسلام کے تعلیمی نظام کی نہایت جامع تصویر اس طرح پیش کی گئی ہے کہ اس میں تعلیمی نصب العین، اخلاق وسیرت، نظام مدارس ودارالاقامہ، اساتذہ اور طلبہ کے فرائض وواجبات سب کا ذکر آگیا ہے۔ تصنیف وتالیف کا شغل بھی اس میں شامل ہے۔

صفحات: ۱۷۷ قیمت: ۹۰ روپے

اخبار علمیہ

نامبیا میں ایک منفرد شہاب ثاقب کی دریافت

صحرائے نامبیا کے قریب گبیون قصبے کے مقامی باشندوں نے شہاب ثاقب کا ایک ٹکڑا پایا۔ اس کی وجہ سے معدنیات کی بے مثال میکانکی خصوصیات کی دریافت ہوئی جو زمین نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ یہ شہاب ثاقب جسے نامبیا کے اصل باشندے نیزے جیسے اوزار بنانے کے لیے استعمال کرتے تھے، اب برٹش میوزیم اور نیویارک کے نیچرل ہسٹری میوزیم جیسے بین الاقوامی عجائب گھروں میں نمائش کے لیے پیش کیا گیا ہے۔ معدنیات کی مکینیکل، کرسٹالوگرافک اور مقناطیسی خصوصیات کا تعین کرنے کے لیے بھی اسے متعدد مطالعات میں استعمال کیا گیا ہے۔ حال ہی میں برطانیہ کی یونیورسٹی آف ناٹنگھم سے وابستہ سائنسدانوں کی یہ تحقیق ”اسکرپٹا میٹیریلیا“ جریدے میں شائع ہوئی ہے۔ ایک جدید تکنیک کا استعمال کرتے ہوئے، جسے لیزر سے چلنے والی اسپیشل اکوسٹک اسپیکٹروسکوپی (LSAS) کہا جاتا ہے، جسے مذکورہ یونیورسٹی کے محققین نے تیار کیا اور پیٹنٹ کرایا، کے مطابق ”یہ مواد لاکھوں سالوں میں منفرد ماحول میں تیار ہوا“۔ رپورٹ کے مطابق، ”یہ دریافت نہ صرف خلائی معدنیات کی خوبصورتی اور پیچیدگی کو اجاگر کرتی ہے بلکہ صنعتی استعمال کے لیے نئے افق بھی کھولتی ہے“۔ (صحیفۃ القدس العربی، ۲۷ مئی ۲۰۲۵ء)

ہیروغلیفی سکھانے کے لیے مصر کی پہلی ویب سائٹ

مصری حکومت نے دلچسپی رکھنے والے افراد اور یونیورسٹی کے طلباء کو قدیم مصری ہیروغلیفی زبان ورسم الخط سکھانے کے لیے ایک ویب سائٹ ”ہیروگلیفکس سٹیپ بائی سٹیپ“ کے نام سے تیار کی ہے جو قدیم مصری زبان کی تعلیم دینے والی پہلی انٹرایکٹو ویب سائٹ ہے۔ اس میں عربی اور انگریزی دونوں زبانوں میں سائنسی مواد موجود ہے۔ ویب سائٹ کا مقصد یونیورسٹی کے طلباء، شوقین افراد اور قدیم مصری زبان میں دلچسپی رکھنے والوں کو ہیروغلیفی سیکھنے کا موقع فراہم کرنا ہے۔ اس قدیم زبان کے احیاء کی کوششیں سنہ ۲۰۱۵ میں اس وقت شروع ہوئیں جب مکتبہ اسکندریہ نے اپنی تعلیمی ویب سائٹ کا پہلا مرحلہ شروع کیا، جس کا مقصد قدیم مصری زبان کو سیکھنے کے لیے جدید ڈیجیٹل آلات کا استعمال کرتے ہوئے لوگوں میں بیداری لانا تھا۔ اس ویب سائٹ کی خاص بات یہ ہے کہ یہ ایک طویل مدتی لغت کے طور پر کام کرتی ہے جو مسلسل اپ ڈیٹ ہوتی رہتی ہے اور اس میں پانچ ہزار سے زیادہ الفاظ شامل ہیں۔ اس کے ذخیرۂ الفاظ کو وسعت دینے کے لیے کام جاری ہے۔ (صحیفۃ الوطن، بحرین ۱۳ جون ۲۰۲۵ء)

ک۔ص اصلاحی

تبصرۂ کتب

ڈاکٹر محمد نعمان خاں، اپنوں کے درمیاں، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات: ۲۰۴، قیمت: ۳۰۰روپے، سن اشاعت: ۲۰۲۲ء، پتہ: ایف-۳، گویل ہری اپارٹمنٹ، پی این بی کالونی، عید گاہ ہلز، بھوپال، ایم پی، ۴۶۲۰۰۱، اور گلشن دسنوی، گرین ویلی، ایرپورٹ روڈ، بھوپال۔

دارالاقبال، دارالکمال، بغداد ہند جیسے القاب و خطابات شہر بھوپال کو تاریخ البلدان میں امتیازی شان عطا کرتے رہے۔ اس شہر کو ہندوستان کا قلب بھی کہا جاتا ہے اور قلب کی سب سے بڑی خوبی یا خصوصیت ہے کہ اگر وہ درست اور صحت مند ہے تو سارا جسم تن درست ہے۔

بھوپال نے اس نصیحت کو اپنے وجود میں اس طرح شامل کیا کہ دل زندہ اور زندہ دلی کی ہر تعبیر اس کے نفس گرم سے جِلا پاتی رہی۔ دو تین سو سال کی چھوٹی سی عمر میں شاید ہی کسی شہر اور ریاست نے امور سلطنت کے ساتھ علم وادب اور اپنے باشندوں کی مخصوص ثقافت کا ایسا دلکش مرقع پیش کیا ہو۔ حسن قدرت کی فیاضیاں بھی شاید اسی لیے اس شہر کے لیے خاص ہو گئیں۔ سرسبز کہساروں اور وادیوں، جھیل اور آبشاروں، باغوں اور تالابوں نے اس شہر کو گویا جنت نشان بنادیا۔ جن کے لیے جنت کی نعمت ہے ان کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ ان کے دل، برائیوں سے پاک اور صاف ہو جاتے ہیں۔ اور یہی دنیا کے زندہ دلان کی علامت بھی ہے۔ اس ساری تمہید کا جواز زیر نظر کتاب کے مشمولات نے عطا کیا۔ بھوپال کی قریب بیس شخصیتوں کا ذکر اس طرح پیش کیا گیا کہ ہستی کے ساتھ پوری بستی، اپنے پن کے احساس سے قاری کے رگ وپے میں سماجائے۔ فاضل مصنف نے ان کو خاکوں سے تعبیر کیا ہے۔ خاکہ نگاری کے فن اور اس کے شرائط وواجبات اور اس کی نزاکت وحساسیت کے تعلق سے ماہرین کی اس رائے سے وہ بے خبر نہیں کہ خاکہ نگاری جہاں اظہار جذبات میں غزل کا سلیقہ چاہتی ہے اور یہ چاول پر قل ھو اللہ لکھنے والی مہارت کی بھی طالب ہے اس سے کہیں زیادہ فاضل خاکہ نگار کا یہ احساس ہے کہ خاکہ افشائے ذات ہی کا نہیں، اخفائے ذات کا مظہر بھی ہے۔ اس کے بعد تو ان خاکوں میں جان آنی ہی تھی۔ انسان کی ذات

وصفات میں اصلاً ایک پوری کائنات پنہاں ہے، اس کائنات کی تصویر کشی آسان نہیں کہ اس کائنات کو ذوق آشکارائی بھی عطا کیا گیا ہے اور جب ذرہ ذرہ اپنی شان دکھانے کے لیے بے قرار ہو تو پھر تصویر ہو یا تعبیر، فن کے امتحان سے گزرنا ہی ہوتا ہے۔ اس کتاب میں یہ مرحلہ جس خوبی وخوبصورتی سے طے کیا گیا ہے، اس کا اندازہ صرف اس کے مطالعہ سے بلکہ اس کی فضائے حرف ولفظ میں بے کراں پرواز ہی سے ہو سکتا ہے، شخصیت کے خط و خال سے لے کر افتاد مزاج اور زندگی کی طرح ہر لمحہ ادلتے بدلتے جسم وجاں کے رنگوں کو جس طرح لفظوں میں صف بند کیا گیا ہے اس نے ان خاکوں کو عجب مسرت آگیں ماحول بخش دیا۔ خاکہ نگار بھی اپنی مرکوز نظر شخصیتوں کی طرح مزاج کے موسمی تغیرات سے جدا نہیں اس لیے کہیں احترام، کہیں بے تکلفی، کہیں لہجہ سنجیدہ تو کہیں شوخ وطنزیہ یعنی خاکہ نگاری کے لیے مطلوب ہر سامان میسر۔ فاضل مصنف ایک عرصے سے بھوپال کے پاکیزہ ادب کی نمائندگی کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ اس معاملہ میں ان کے سہیم وشریک اقبال مسعود ہیں جن کے خاکے کے بغیر اپنوں کی یہ محفل مکمل ہو نہیں سکتی تھی۔ انھوں نے خوب کیا کہ خود خاکہ نگار کے اندرون کی سیر کر کے بتایا کہ کیوں یہ خاکے اخلاق وسیرت کے کارناموں اور دنیا کی بے ثباتی اور مکر وفریب کی کہانیوں میں بدل گئے۔ ہمہ آفتاب بینم، ہمہ آفتاب گویم کے عنوان سے بہتر ان مضامین اور صاحب مضامین کا تعارف کیا ہو سکتا ہے۔ ان داستانوں کا لہجہ، درمیان میں جاں فزا جملوں، فقروں اور شعروں نے شخصیتوں کے اعتبار کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے۔ افادی ادب کا مقصد اس کے سوا اور کیا ہے؟ ایسی تحریروں کے لیے قاری کے لبوں پر کلمہ شکر یقیناً کچھ اور کی آرزو کی امید جگا دیتا ہے۔ (محمد عمیر الصدیق ندوی)

محمد جرجیس کریمی، ظلم کے ازالے میں اسلام کا کردار، کاغذ وطباعت عمدہ، غیر مجلد، صفحات: ۲۱۶، ملنے کا پتہ: مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی، ۲۰۲۴ء، قیمت: ۱۸۰ روپے۔ ای میل: idaratahqeeq2016@gmail.com

ظلم واستبداد کسی بھی سلیم الفطرت انسانی معاشرے اور تہذیب کے کسی بھی دور میں روا نہیں سمجھا گیا۔ اسلام میں یہ ایک عظیم اور ناقابل معافی گناہ ہے لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ انسانی تاریخ کے معدودے چند ادوار کو چھوڑ کر ہر دور میں ظلم کی چکی کسی نہ کسی شکل میں چلتی رہی اور اس کا پہیا کبھی رکا نہیں۔ اس کی بہ ظاہر وجہ عقیدۂ توحید و آخرت اور عمل کے محاسبے کا صحیح

معنوں میں عدم احساس ہے۔ عصر حاضر میں یہ خلاف انسانیت عمل اپنے عروج و شباب پر ہے اور دنیائے انسانیت کے لیے بڑا مسئلہ بن گیا ہے۔ اسلام کی تعلیمات اس سلسلے میں بالکل واضح ہیں۔ اس کتاب میں اس اہم، حساس اور ضروری موضوع پر تفصیل سے محققانہ گفتگو کی گئی ہے۔

مصنّف کے نزدیک ظلم ایک ایسی حالت یا عمل کو کہتے ہیں جس میں کسی کو اس کا حق نہ دینا، کسی چیز کو اس کے مقام پر نہ رکھنا یا ناحق کسی پر زیادتی شامل ہے۔ استحصال کو بھی انہوں نے ظلم ہی مانا ہے جو عام طور پر کمزور یا بے بس افراد کے حقوق سے فائدہ اٹھانے کے لیے کیا جاتا ہے۔ ظلم و استبداد کی مختلف قسموں میں انہوں نے بجا طور پر معاشی، سماجی، سیاسی، جنسی، تعلیمی، ماحولیاتی استحصال کو شامل کیا ہے۔

اس کتاب میں کل پانچ ابواب ہیں اور ہر باب کے تحت متعدد فصلیں ہیں۔ پہلے باب میں عصر حاضر میں مزدوروں، عورتوں، بچوں، مسلم اقلیتوں، قیدیوں اور پناہ گزینوں پر دنیا بھر میں ہونے والے مظالم کی تفصیلات پیش کی گئی ہیں۔ دوسرے میں ازالۂ ظلم کے لیے ہونے والی کوششوں کا مغربی افکار و نظریات اور جمہوری نظام کی روشنی میں جائزہ لیا گیا ہے۔ تیسرے میں انسانوں پر ظلم کے خلاف اسلامی نقطۂ نظر کی محققانہ توضیح و تشریح کی گئی ہے۔ چوتھے میں حق دفاع اور اس کی شرعی حیثیت پر بڑی معرکہ آرا اور دلنشیں بحث ہے۔ پانچویں باب میں عدل و مساوات کو اسلام کی دو بنیادی قدریں قرار دے کر اسلامی معاشرے میں قیام عدل و مساوات کے نظام کی وضاحت کی گئی ہے۔

یہ کتاب ظلم کی نوعیتوں اور اس کے شکار طبقات کا احاطہ کرتے ہوئے اس کے خاتمے میں اسلامی کردار کی تاریخ اور اس کے ازالے کا ایک ایسا جامع اور قابل تقلید لائحۂ عمل پیش کرتی ہے اور ایک ایسے وقت میں منظر عام پر آئی ہے جب کہ پورا خطۂ ارض اس آگ کی زد پر ہے۔ اپنے تحقیقی انداز اور مدلل اسلوب کے سبب امید ہے کہ یہ سنجیدہ طبقے میں مقبول ہو گی۔ (کلیم صفات اصلاحی)

محمد انس فلاحی مدنی، کسب معاش کا اسلامی تصور، کاغذ و طباعت عمدہ، غیر مجلد، صفحات: ۱۷۶، ملنے کا پتہ: مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی، ۲۰۲۴ء، قیمت: ۱۸۰ روپے۔ ای میل: idaratahqeeq2016@gmail.com

اسلام نے مال کو ضرورت زندگی قرار دیا ہے اور حلال طریقے سے جتنا چاہے کمانے کا اختیار عام مسلمانوں کو دیا ہے، البتہ فضول خرچی کی ممانعت اس لیے کی ہے کہ اس گاڑھی کمائی میں اس

نے دوسروں کے حقوق رکھے ہیں۔ اسراف و تبذیر سے حق تلفی ہوتی ہے۔ آج دنیا میں کسب معاش کے ایسے ایسے طریقے رائج و مستعمل ہیں کہ ان میں جائز و ناجائز کا پتا لگانا مشکل بلکہ ناممکن ہو گیا ہے۔ اس کتاب میں کسب معاش کے اسلامی موقف، طورطریقوں اور معتدل نقطۂ نظر کی محققانہ تفصیل پیش کی گئی ہے۔ اس موضوع پر اس سے قبل متعدد اہم کتابیں تصنیف کی جاچکی ہیں، مگر مصنّف کے مطابق حصول مال کی جدوجہد کا اسلامی پہلو ان کتابوں میں موجود تو ہے لیکن ان میں پوری آب و تاب کے ساتھ یہ پہلو نہیں آسکا ہے۔ اس کی وجہ دین و دنیا کے قرآنی تصور کی جگہ زہدوورع کے عجمی تصور کا آجانا ہے۔

کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے اور ہر باب کے تحت متعدد فصلوں میں منقسم ہے۔ پہلے باب میں قرآن و سنت کی روشنی میں دنیوی زندگی کی حقیقت واضح کی گئی ہے اور زہدوورع اور عبادات کے غیر اسلامی تصور پر تنقید کی گئی ہے۔ دوسرے میں حصول رزق کے ترغیبی پہلوؤں کو قرآن و سنت کی روشنی میں آشکارا کیا گیا ہے۔ تیسرے میں جائز و ناجائز وسائل و ذرائع زیر بحث آئے ہیں۔ چوتھے میں آنحضورؐ کی معاشی زندگی کے تابناک پہلوؤں کی نشاندہی، پانچویں میں خرچ کے مواقع کی تفصیل اور چھٹے میں کسب و صرف اموال کے اسلامی و غیر اسلامی تصورات کے نتائج پر عمدہ گفتگو کی گئی ہے۔ امانت و دیانت، دھوکے سے اجتناب، شفافیت، خریدار اور کام کرنے والے مزدوروں کے حقوق کی رعایت کو کسب معاش کے اسلامی اصولوں میں اور تجارت، زراعت، مزدوری، صنعت و حرفت اور ملازمت کو جائز اور سود، جوا اور رشوت کو ناجائز ذرائع معاش میں شمار کیا ہے۔ لاٹری، دلّالی اور بعض جدید ذرائع معاش جیسے ریئل اسٹیٹ اور ٹریڈنگ وغیرہ کے بارے میں خاموشی ہے۔

کتاب آسان اسلوب میں اپنے موضوع پر تفصیلی مواد فراہم کرتی ہے اور کسب معاش کے تقریباً ہر مفید پہلو کا احاطہ بالخصوص اسلامی نقطۂ نظر کو واضح کرتی ہے۔ اعراب قرآنی آیات کے لیے مخصوص ہونا چاہئے۔ ترجمہ ہو تو بہ جز ضروری مقامات کے حوالہ کافی سمجھا جانا چاہئے۔ اصل عبارت نقل کرنے سے کتاب کی ضخامت خواہ مخواہ بڑھ جاتی ہے۔ (ک۔ص اصلاحی)

محمد صادر ندوی، مکالمہ بین المذاہب: موجودہ صورت حال اور مطلوبہ موقف، کاغذ وطباعت عمدہ، غیر مجلد، صفحات ۱۱۲، ملنے کا پتہ: مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی، ۲۰۲۴ء،

قیمت: ۱۸۰روپے، ای میل: idaratahqeeq2016@gmail.com

مذاکرات و مکالمات میں بین المذاہب مکالمہ بہت اہمیت کا حامل ہے۔ بین المذاہب مکالمہ کی ابتدائی تاریخ، اسلام سے وابستہ ہے۔ تَعَالَوْاْ إِلَی کَلَمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ کی آواز آنحضورؐ کے توسط سے دنیا کے کان میں پہلی بار پڑی۔ عصر حاضر میں اس کا مقصد تمام مذاہب میں ایسی بنیادیں تلاش کرنا ہے جو ملکوں اور معاشروں میں امن و سلامتی اور تفاہم کے لئے ضروری ہیں۔ اس سے پہلے اس موضوع پر ۲۰۰۷ء میں مولانا ولی خاں المظفر کی کتاب مکالمہ بین المذاہب کراچی سے شائع ہو چکی ہے۔ لیکن زیر تبصرہ کتاب اس لیے اہم اور قابل توجہ ہے کہ اس میں مکالمے کی موجودہ صورت حال اور اس کے مطلوبہ موقف پر نہ صرف تاریخی، تحقیقی، مدلل اور بامعنی گفتگو کی گئی ہے بلکہ بین المذاہب مکالمے کے مغربی اہداف و مقاصد کا تعاقب کرتے ہوئے اس پوری بحث کو صحیح رخ پر ڈالا گیا ہے۔

چنانچہ مکالمے کی تعریف و تاریخ، پہلی عالمی کانفرنس، اس کے مقاصد، مکالمے کی اقسام، مکالمے کی قرآنی بنیاد اور مقاصد، عالمی مذاہب میں نقطۂ اتصال، توحید، آسمانی کتابوں اور ویدانت میں تصور وحدانیت اور عقیدۂ تثلیث پر جامع گفتگو کی گئی ہے۔ ابوطالب، عتبہ بن ربیعہ اور نجران کے عیسائیوں سے آپؐ کے مکالمات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس کے بعد بین المذاہب مکالمات کے مغربی اصولوں کا اعتراف، باہمی احترام اور مذہبی آزادی، حقیقت کو سمجھنے کی کوشش، نظریات اور عمل کا عمل سے موازنہ، نزاعی مسائل سے اجتناب وغیرہ کی نشاندہی کرتے ہوئے مصنّف نے یہ بات صحیح لکھی ہے کہ بہ ظاہر ان اصولوں میں کوئی ایسی چیز نظر نہیں آتی جو اسلام سے ٹکراتی ہو۔ البتہ اصول میں نرمی اور لچک اس لیے رکھی گئی ہے تاکہ فریق ثانی کو بہ آسانی دام میں پھنسایا جاسکے۔ بین المذاہب کانفرنسوں کا سلسلہ ایک عرصے سے جاری ہے تاہم اس کے غیر مؤثر اور نتیجہ خیز نہ ہونے کی اصل وجہ مصنّف کے مطابق یہ ہے کہ تصور وحدانیت کو بنیاد بنا کر مکالمے سے شعوری طور پر احتراز کیا جاتا ہے (ص ۱۰۶)۔ اس اہم نکتے کو نظر انداز کرنا ان مکالمات کی ناکامی کی اصل وجہ ہے۔ ۴۶ عربی، ۱۱۴ اردو، ۱۱۳ انگریزی مراجع و مصادر اور ۹ ویب سائٹس سے اس کتاب میں استفادہ کیا گیا ہے۔ اس لیے اس کی دلآویزی اور نافعیت میں کوئی شبہ نہیں۔ (ک۔ص اصلاحی)

ادبیات

قصیدہ

ضمیمہ حدائق الریحان منظوم اردو ترجمانی منتخب قصائد حضرت حسانؓ

ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی

گوشۂ مطالعاتِ نعت، علی گڑھ، موبائل:۹۸۹۷۸۲۰۷۷۷

متی یبد فی الداجی البهیم جبینه[۱]
یلح مثل مصباح الدجی المتوقد

گھپ اندھیری رات میں آقاؐ کی پیشانی پاک — سامنے آنکھوں کے جب ہوتی یکایک آشکار
ایسا لگتا تھا کہ کوئی ماہتابِ ضوفشاں — ہم کو دکھلاتا ہے اپنی تابناکی کی بہار

فمن کان او من یکون کاحمد[۲]
نظام لحقّ، او نکال لملحد

آپؐ جیسا کون تھا؟ ہے کون؟ ہو سکتا ہے کون — جس نے دنیا میں کیا ہو حق کا یوں قائم نظام
اور بے دینوں کو ان کے کیفر کردار تک — جس نے پہنچانے کا ایسا ہی کیا ہو اہتمام

---

(۱)، (۲) ان دونوں شعروں کو متعدد لوگوں نے حضرت عایشہؓ سے منسوب کیا ہے، جو درست نہیں ہے۔ ''دیوان حسانؓ'' (دار صادر، بیروت) کے ۱۳۸۸ھ کے اڈیشن کے ص ۶۰ پر ان دو شعروں کو ''مصباح الدجیٰ'' کے زیر عنوان درج کیا گیا ہے اور عنوان کے نیچے یہ نوٹ بھی ہے: وقال فی اسدالغابۃ: وصفت عایشۃؓ رسول اللہ ﷺ، فقالت: کان واللہ کما قال فیہ حسانؓ۔ یعنی حضرت عایشہؓ نے کسی موقع پر نبی کریم ﷺ کی توصیف کرتے ہوئے حضرت حسانؓ کے یہ دو شعر پڑھے تھے یہ کہہ کر کہ خدا کی قسم آپؐ بالکل ایسے ہی تھے جیسا حضرت حسانؓ نے اپنے ان دو شعروں میں آپؐ کے بارے میں کہا ہے۔ (دیوان حسانؓ، ص ۶۰، بحوالہ اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہؓ)

مستشعری حلق الماذیّ یقدمهم
جلد النحیزة، ماضٍ غیر رعدید

مری نظر میں ہے اب تک وہ بدر کا منظر کہ جب صحابہؓ کے تن پر تھیں آہنی زرہیں
اور ان کے قائدِ لشکر تھے ایک مردِ جری مثال جن کی نہیں حزم و حلم و قوت میں

أعنی الرسولَ فإن اللّٰهَ فضّلَه
علی البریّۃ بالتقوی وبالجودِ

بتاؤں تم کو، وہ قائد تھے کون مردِ عظیم وہ تھے رسولِؐ خدا، رہنمائے جنّ و بشر
خدا نے جن کو سخاوت میں اور تقویٰ میں فضیلت اپنے کرم سے دی، کل خلائق پر

وقد زعمتم بأن تحموا ذمارکم
وماء بدرٍ زعمتم، غیر موروِدِ

تمہیں یہ زعم تھا اپنی تمام ملک و متاع نگاہ و دست رسِ غیر سے بچالو گے
سمجھ رہے تھے یہ دل میں کہ آب چشمۂ بدر خدا نے پیدا کیا ہے فقط تمہارے لیے

وقد وردنا ولم نسمع لقولکم
حتی شربنا رواء، غیر تصرید

تمہارے دعوے دھرے رہ گیے سب ایک طرف مقامِ بدر یہ ہم نے پڑاؤ ڈال دیا
اور اس کے چشمۂ شیریں کے صاف پانی کو بغیر جھجکے ہوئے، خوب سیر ہو کے پیا

مستعصمین بحبلٍ غیر منجذم
مستحکمٍ من حبال اللّٰہ ممدودِ

مخالفانِ خدا و رسولؐ و دینِ رسولؐ! ہماری ہمت و جرأت کا راز جانتے ہو؟
کہ ہم ہیں پکڑے ہوئے اپنی پوری قوت سے خدا کی رسیوں سے اک اٹوٹ رسی کو

فینا الرسول وفینا الحق نتبعہ
حتی الممات ونصر غیر محدود

ہمارے بیچ میں موجود ہیں رسولِ خداؐ خدا کی نصرتِ بے انتہا بھی ساتھ میں ہے
کریں گے آخری سانسوں تک اتباعِ رسولؐ کہ حق کا پرچمِ عالی ہمارے ہاتھ میں ہے

ماضٍ علی الھولِ، رکّاب لما قطعوا
إذا الکماۃ تحاموا فی الصنادید

کسی خطر کو نہ لائے کبھی جو خاطر میں وہ شہسوار یگانہ ہیں سرورِ عالمؐ
بہادروں کے جہاں حوصلے وفا نہ کریں وہاں ہیں فاتحِ میداں وہ رہبرِ عالمؐ

وافٍ وماضٍ، شھاب یستضاء بہ
بدر أنار علی کل الأماجید

وفا شعار ہیں، مقصد یہ جمنے والے ہیں وہ اک ستارہ ہیں ملتی ہے روشنی جس سے
ستارہ ہی نہیں، وہ ایک بدرِ کامل ہیں تمام اہلِ شرف کو ضیا ملی جس سے

مبارک کضیاء البدر صورتہ
ما قال کان قضاءً غیر مردود

رسولِ پاکؐ کی ہستی ہے مجمع البرکات مثالِ بدر، درخشاں ہے ان کا روئے جمیل
وہ جو بھی کہتے ہیں، ہوتا ہے وحی پر مبنی قضا کی طرح نہیں ہوتی اس میں کچھ تبدیل

ما بالُ عینک لا تنام کأنما
کُحِلت مآقیھا بکحل الأرمد

ہوا ہے کیا تری آنکھوں کو، کیوں ہیں یہ بیدار؟ کہ ان کی نیند ہی یک لخت اڑ گئی جیسے
کہ جیسے ان میں لگایا گیا ہے وہ سرمہ جو وجہِ سوزش و آشوب چشم بن جائے

جزعاً علی المهدیّ، أصبح ثاویاً
یا خیرَ مَن وطئ الحصی، لا تبعد

یہ کیا رسولؐ کے غم میں ہیں وقفِ حزن وملال وفات پا گیے جو، چھپ گیے نگاہوں سے
رسولِ پاکؐ، اے دنیا کے بہترین انساں! نہ دور جایئے آقاؐ، ہماری راہوں سے

وجهی یقیکَ الترب لهفی، لیتنی
غیبت قبلک فی بقیع الغرقد

اے وائے، کاش مرے اختیار میں ہوتا کہ خاکِ قبر سے میں آپ کو بچا پاتا
اے کاش، آپؐ سے پہلے بقیعِ مرقد میں مرا وجود، مرا جسم دفن ہوجاتا

بأبی وأمی، مَن شهدتُ وفاته
فی یوم الاثنین النبیُّ المهتدی

فدا ہوں سیدِ کونینؐ پر مرے ماں باپ وفات پائی دوشنبہ کے روز آقاؐ نے
جو دو جہاں کے نبی، مرجعِ ہدایت ہیں تھا میں بھی اس گھڑی دیدار کرنے والوں میں

فظلتُ بعد وفاته متبلداً
متلدّدا، یا لیتنی لم أولد

ہوا یہ حال مرا، آپؐ کی وفات کے بعد سراپا غم ہوں کہ یہ حادثہ ہے سخت کٹھن
نہ جنتی کاش مری مہربان ماں مجھ کو نہ ہوتا کاش میں پیدا، نہ دیکھتا یہ دن

أ أقیم بعدک بالمدینة بینهم
یا لیتنی صُبِّحتُ سمّ الأسود

رہوں میں کیسے مدینہ میں، آہ، آپؐ کے بعد کہ زندگی تو مری، زندگی بس آپؐ سے تھی
یہ ہوتا کاش اسی دن کہ زہرِ مار سیاہ پلا کے کوئی مٹا دیتا زندگی میری

أو حلَّ أمر الله فینا عاجلاً
فی روحۃٍ من یومنا أو فی غد

یا جلد ایسا ہو، ہم غمزدوں کے حق میں بھی خدائے پاک کی جانب سے حکم آجائے
کہ اب ہمارے لیے کیا رکھا ہے دنیا میں وہ حکم آج ہی آجائے یا کہ کل آئے

فنقوم ساعتنا، فنلقیٰ طیّباً
محضاً ضرائبہ کریم المحتد

پھر ایسا ہو کہ قیامت ہی ہم یہ قائم ہو نصیب ہو ہمیں دیدارِ سرور عالمؐ
جو پاک اصل ہیں اور طینت وطبیعت کی تمام خوبیاں جن کے وجود میں ہیں بہم

یا بِکرَ آمنۃ المبارک ذکرہ
ولدتہ محصنۃ بسعد الأسعد

اے آمنہ کے دلارےؐ، جنا انھوں نے جسے بہ پاک نفسی و یمن و سعادتِ ازلی
کہ جس کا ذکر بھی باعث ہے خیر وبرکت کا ہے جس کی ذات کے ہمراہ رحمت باری

نوراً أضاء علی البریّۃِ کلِّھا
مَن یُھدَ للنور المبارک یھتدی

تھی ذات آپؐ کی آقا اک ایسا نور ہدیٰ کہ جس نے روشنی پھیلائی کل خلائق پر
جو نورِ پاک کی برکت سے راہ یاب ہوا ہوا ہے صرف وہی دو جہاں میں بختاور

یا ربِّ فاجمعنا معاً ونبیّنا
فی جنّۃٍ تثنی عیون الحُسَّد

خدائے پاک، ہمیں اور رسولِ اکرمؐ کو تو کردے اپنے کرم سے بہشت میں یکجا
ہو حاسدوں کی نظر خیرہ، دیکھ کر جس کو اس اجتماع کا منظر ہو ایسا جشن نما

فی جنّةِ الفردوس واکتبها لنا
یا ذا الجلال وذا العلا والسُّودَدِ

خدائے پاک! تری شان ہی کے شایاں ہے　　　تمام عظمت و بالا تری و آقائی
ملادے جنتِ فردوس میں ہمیں یا رب　　　ہمارے واسطے لکھ دے سب اس کی زیبائی

واللهِ أسمع ما بقیت بها لک
إلّا بکیت علی النبی مُحَمَّد

قسم خدا کی، ہے جب تک بھی زندگی میری　　　کسی کی موت کی جب بھی سنوں گا کوئی خبر
اٹھے گی ہوک، مرے دل میں، یادِ سرورؐ سے　　　بہیں گے اشک، وفاتِ رسولِ اکرمؐ پر

یا ویحَ أنصارَ النبیّ ورهطِهٖ
بعدَ المغیَّبِ فی سواء الملحَد

ہوا ہے ہائے یہ کیا حال یاورانِ نبیؐ　　　پڑی ہے کیسی بلا میں جماعتِ سرورؐ
رسولِ پاکؐ کے کنجِ لحد میں چھپنے سے　　　نظامِ زیست ہی گویا ہوا ہے زیر و زبر

ضاقت بالأنصار البلادُ فأصبحت
سوداً وجوهُهم کلَونِ الإثمد

ہوئے ہیں تنگ بلاد و دیار ان کے لیے　　　بتاؤں کیا، کہ ہوئی کیسی حالتِ انصار
وفاتِ سیدِ عالمؐ کے غم کی شدت سے　　　سیاہ چہرہ نظر آتے ہیں سب، اثمدوار

ولقد ولدناه وفینا قبره
وفصول نعمتِهٖ بنا ، لم یُجحدِ

زہے شرف کہ ہمیں میں ہوئی ولادت بھی　　　ہمارے شہر کی عزت ہے قبر اطہر سے
کیے ہیں آپؐ نے ہم پر بہت ہی احسانات　　　کہ جن کا ہم کبھی انکار کر نہیں سکتے

والله أكرمنا بہ وهدیٰ بہ
أنصاره في كل ساعةِ مشهد

بنایا آپ کو خالق نے ہادیِ انصار تو بے گماں انھیں ہر راہ، راہِ راست ملی
رہِ حیات کے ہر مرحلے میں عزّ و وقار خدا نے ہم کو دیا آپؐ کی بدولت ہی

صلّى الألٰہ ومن يحُفُّ بعرشہ
والطيبون على المبارک أحمد

خدائے پاک کی رحمت ہو پیہم آپؐ پر اور خدا کے عرش کے اطراف جو فرشتے ہیں
جہاں میں جتنے بھی ہیں پاک تر ذوات و نفوس درود سب کی ہی جانب سے آپؐ پر پہنچیں

نبِّ المساكين أنّ الخيرَ فارقهم
مع النبيِّ تولّى عنهم سَحَرا

خبر دیدو یہ مسکینوں، غریبوں، بے سہاروں کو رسولِ پاکؐ سے جو خیر و برکت ان کو حاصل تھی
سحر کے وقت جب دنیا سے آقاؐ ہو گیے رخصت نبیؐ کے ساتھ ہی دنیا سے رخصت ہو گئی وہ بھی

مَن ذا الذي عنده رحلي وراحلتي
ورزق أهلي إذا لم يونسوا المطرا

مرے مسکن، مرے مرکب کی ہوگی فکر اب کس کو نہیں ہیں آپؐ تو اب کون میرا حال پوچھے گا
مرے اہل و عیال اب قحط سے ہوں گے پریشاں جب انھیں آسودہ فرمائے گا اب دستِ کرم کس کا

أم من نعاتب لا نخشى جنادعہ
إذا اللسان عتا في القول أو عثرا

زبانیں جب ہماری بولنے میں لڑکھڑا جائیں بگڑ جائے توازن جب تلفظ کا، تکلم کا
کرے گا کون ہم کو سرزنش اب اس محبت سے کسی نقصان کا جس سے نہ ہو گا کوئی اندیشہ

كان الضياء وكان النور نتبعہ
بعد الإلٰہ وكان السمع والبصرا

ضیا تھی، نور تھا روئے زمیں پر آپؐ کے دم سے سماعت آپؐ ہی سے تھی ہماری اور بصارت بھی
ملی راہِ ہدایت آپؐ ہی سے ہم کو دنیا میں خدا کے بعد ہم کرتے ہیں طاعت صرف آقاؐ کی

فلیتنا یومَ وارُوہ بملحدہٖ
وغیّبوہ و اُلقَوا فوقہ المدرا

اسی دن جب چھپایا لوگوں نے قبر مقدس میں　　لرزتے ہاتھوں، روتے دل سے جسمِ پاک آقاؐ کا
کیا سربستہ پھر اس قبر کو مٹی کے ڈھیلوں سے　　اسی دن کاش ایسا واقعہ بھی رونما ہوتا

لم یترُکِ اللہُ منّا بعدَہ اَحَداً
ولم یَعِیشُ بعدَہ انثیٰ و لا ذکراً

خدائے قادر و قیوم ہم سب غمزدوں میں سے　　نہ رہنے دیتا زندہ ایک کو بھی بعد آقاؐ کے
نہ جیتا بعد آقاؐ کے کوئی بھی کاش دنیا میں　　ہمارے مرد و عورت سب یکایک مر گیے ہوتے

ذلّت رقاب بنی النجّار کلّھم
وکان أمر من أمر اللہ قد قدرا

جھکی ہیں فرطِ غم سے گردنیں نجار زادوں کی　　سبھی کرتے ہیں ماتم دل میں اپنی بے بسی کا ہم
یہ تھا اک فیصلہ، اللہ ہی کے فیصلوں میں سے　　جو نافذ ہو گیا اس کی طرف سے، ہے وہی احکم

کنتَ السوادَ لِناظری
فعمی علیک الناظر

اے مرے پیارے نبیؐ، میرے انیس و غمگسار　　نور آنکھوں کا، مری آنکھوں کی پتلی آپؐ تھے
ہو گئیں آنکھیں مری بے نور، اے شمعِ ھدیٰ　　جب اچانک آپ اس دنیا سے رخصت ہو گیے

مَن شَاءَ بعدک فلیَمُت
فعلیکَ کنتُ اُحاذر

آپؐ ہی جب اس جہاں سے کر گیے آقاؐ سفر　　اب مجھے پروا نہیں، مر جائے چاہے کوئی بھی
اب رہا ہی کیا جہاں میں، آپؐ کے جانے کے بعد　　میری سب فکروں کا مرکز آپؐ ہی کی ذات تھی

رسید کتب موصولہ

شاہد عمادی، اسلامی عہد زریں کے مشاہیر سائنس داں: مجلس تحقیقات و نشریاتِ اسلام، ٹیگور مارگ، ندوۃ العلماء، لکھنؤ، صفحات: ۲۷۲، سالِ اشاعت: ۲۰۲۵ء، قیمت: ۳۰۰روپے، فون نمبر: ۰۵۲۲-۲۷۴۱۵۳۹

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، انتخاب مکاتیب شبلی: مغربی بنگال اردو اکاڈمی، رفیع احمد قدوائی روڈ، کولکاتا، صفحات: ۱۶۰، سالِ اشاعت: ۲۰۲۴ء، قیمت: ۱۱۶روپے، موبائل نمبر: ۹۸۳۸۵۷۳۶۴۵

مولانا ممشاد علی قاسمی، بڑوں کی باتیں: مکتبہ احسان، حسن منزل، ندوہ روڈ، ڈالی گنج، لکھنؤ، صفحات: ۳۳۶، سالِ اشاعت: ۲۰۲۳ء، قیمت: درج نہیں، موبائل نمبر: ۹۹۲۷۲۳۴۲۷۴

پروفیسر عبدالرحیم قدوائی، رفیق احمد رئیس سلفی (مرتب)، جہاتِ قرآنیات: پروفیسر خلیق احمد نظامی، مرکز علوم القرآن، علی گڑھ، صفحات: ۳۷۶، سالِ اشاعت: ۲۰۲۴ء، قیمت: ۵۰۰روپے، موبائل نمبر: ۹۸۹۷۶۷۴۵۵۰

پروفیسر ابوسفیان اصلاحی، صدائے نحیف: شعبۂ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، صفحات: ۴۴۲، سالِ اشاعت: ۲۰۲۵ء، قیمت: ۵۰۰روپے، موبائل نمبر: ۹۸۹۷۶۷۴۵۵۰

محمد اقبال، ڈاکٹر خالد ندیم (مترجم)، فہم خودی و بے خودی: دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، صفحات: ۲۰۵، سالِ اشاعت: ۲۰۲۵ء، قیمت: ۳۰۰روپے، ای میل: info@shibliacademy.org

ڈاکٹر ظفرالاسلام خان، قرآنی اعجاز: دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، صفحات: ۵۷، سالِ اشاعت: ۲۰۲۵ء، قیمت: ۱۰۰روپے، ای میل: info@shibliacademy.org

قاضی عیاض اندلسیؒ، محمد علاء الدین ندوی (مترجم)، کتابِ شفا در حقوقِ مصطفیٰ: مکتبہ حراء، نزد شباب مارکیٹ، لکھنؤ، صفحات: ۶۱۶، سالِ اشاعت: ۲۰۲۵ء، قیمت: ۱۰۰۰روپے، موبائل نمبر: ۹۸۲۱۴۲۴۱۲۷

محمد علاء الدین ندوی، نئی نسل کے دین و ایمان کا تحفظ: حراء بکڈپو، شباب مارکیٹ، ٹیگور مارگ، ڈالی گنج، لکھنؤ، صفحات: ۱۲۸، سالِ اشاعت ۲۰۲۵ء، قیمت: ۱۶۰روپے، موبائل نمبر: ۷۰۰۷۸۹۲۰۰۵

محمد اویس سنبھلی، یادیں باتیں چہرے لوگ: بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ، صفحات: ۲۴۰، سالِ اشاعت: ۲۰۲۵ء، قیمت: ۴۰۰روپے، موبائل نمبر ۷۹۰۵۶۳۶۴۴۸

تصانیف سید صباح الدین عبدالرحمٰنؒ

اسمائے کتب	قیمت	اسمائے کتب	قیمت
حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ	20/-	ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں	60/-
حضرت ابوالحسن ہجویری	20/-	ظہیر الدین محمد بابر (ہندو مورخین کی نظر میں)	300/-
مولانا شبلی نعمانی پر ایک نظر	70/-	ہندوستان کے بزم رفتہ کی سچی کہانیاں (اول)	150/-
محمد علی کی یاد میں	250/-	ہندوستان کے بزم رفتہ کی سچی کہانیاں (دوم)	100/-
بزم رفتگاں اول	240/-	ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان	
بزم رفتگاں دوم	250/-	حکمرانوں کی مذہبی رواداری (اول)	75/-
صوفی امیر خسرو	150/-	ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان	
اسلام میں مذہبی رواداری	250/-	حکمرانوں کی مذہبی رواداری (دوم)	100/-
بزم تیموریہ اول	400/-	ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان	
بزم تیموریہ دوم	220/-	حکمرانوں کی مذہبی رواداری (سوم)	150/-
بزم تیموریہ سوم	260/-	مغل بادشاہوں کے عہد میں ہندوستان	
بزم صوفیہ	350/-	سے محبت و شیفتگی کے جذبات	150/-
ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک ایک جھلک	240/-	مقالات سلیمان (اول)	400/-
ہندوستان کے عہد وسطیٰ کا فوجی نظام	425/-	غالب مدح وقدح کی روشنی میں (اول)	350/-
ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی جلوے	250/-	غالب مدح وقدح کی روشنی میں (دوم)	150/-
بزم مملوکیہ	250/-	سید سلیمان ندوی کی دینی وعلمی خدمات پر ایک نظر	60/-
ہندوستان کے سلاطین علما اور مشائخ پر ایک نظر	250/-	مولانا سید سلیمان ندوی کی تصانیف کا مطالعہ	150/-
ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے		عالم گیر (انگریزی)	100/-
تمدنی کارنامے	200/-	صلیبی جنگ	25/-

JULY 2025 Vol- 212(07) ISSN 0974-7346 Ma'arif(Urdu)-Print

RNI. 13667/57 MA'ARIF AZM/NP- 43/2023-25

Monthly Journal of

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

P.O.Box No: 19, Shibli Road, AZAMGARH, 276001 U.P. (INDIA)

Email: info@shibliacademy.org

دارالمصنّفین کی چند اہم کتابیں

مطالعات شبلی	پروفیسر اشتیاق احمد ظلی	550/-
حیات سعدی	خواجہ الطاف حسین حالی	400/-
شبلی شناسی کے اولین نقوش	پروفیسر ظفر احمد صدیقی	600/-
امام رازی	مولانا عبدالسلام ندوی	320/-
شبلی کی آپ بیتی	ڈاکٹر خالد ندیم	325/-
تاریخ اسلام (اول و دوم اور سوم و چہارم)	شاہ معین الدین احمد ندوی	1060/-
تاریخ صقلیہ (اول و دوم)	مولانا سید ریاست علی ندوی	800/-
مطالعۂ مذاہب کی اسلامی روایت	پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی	300/-
مختصر تاریخ ہند	مولانا ابوظفر ندوی	80/-
ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں	مولانا ابوالحسنات ندوی	80/-
مرزا دبیر کی شاعری	مولانا ضیاء الدین اصلاحی	150/-
تعلیم - عہد اسلامی کے ہندوستان میں	پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی	100/-
عہد اورنگ زیب میں علماء کی خدمات	ڈاکٹر علاء الدین خاں	380/-
آثار شبلی	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	500/-
شبلی کی ادبی و فکری جہات	ڈاکٹر شمس بدایونی	200/-

دارالمصنّفین کی نئی مطبوعات

روایاتِ سیرت نبویؐ (بلاذری کے حوالے سے)	مولانا کلیم صفات اصلاحی	450/-
مصادرِ سیرت نبویؐ (مجموعۂ مقالات سیمینار)	مرتبہ: مولانا کلیم صفات اصلاحی	600/-
عہد اسلامی کا ہندوستان: معاشرت، معیشت اور حکومت کے مسائل	پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی	300/-
وفیات مشاہیر (مولانا ضیاء الدین اصلاحی)	ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں و سلیم جاوید	600/-
دارالمصنّفین کے سو سال (اضافہ شدہ)	مولانا کلیم صفات اصلاحی	500/-